نگار

قیمت ۸ر

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانون کا مجموعہ نگارستان نے ملک مین جو درجہ قبولیت حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانون مین منتقل کیے گئے قیمت علاوہ محصول ع۱۲

گہوارۂ تمدن

مولانا نیاز کی وہ معرکۃ الآرا کتاب جس مین تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن مین عورت نے کتنا بڑا حصہ لیا ہے اور دنیائے تہذیب و شائستگی اسکی کسقدر ممنون ہے اردو مین بالکل پہلی کتاب ہے قیمت علاوہ محصول ۱۲

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان مین بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان اسکی تخییل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون و اسکی انشا پردازی سحر حلال کے درجہ تک پہونچ گئی ہے قیمت علاوہ محصول عہ

فراست الید

مؤلفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیرون کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات صحت و بیماری شہرت و نیکنامی وغیرہ کے متعلق صحیح پیشینگوئی کرسکتا ہے قیمت علاوہ محصول ۱ر

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کا تمام نشاط بخش کیفیات اسکے ایک جملہ مین موجود ہین یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اسقدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ مل نہین سکتی قیمت علاوہ محصول ۱۰ر

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید لکھی تھی بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے انکی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے اردو مین یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بہترین نمونے اسمین نظر آئینگے قیمت علاوہ محصول

صحابیات

جسمین عہد سعادت کی خواتین کے مستند حالات یکجا کردیے گئے ہین اسکا مقدمہ مولانا نے خاص اپنی انشاء مین لکھا ہے اس کتاب مین ۱۰۰ صحابیات سے زیادہ صحابیات کے حالات درج ہین طباعت و کتابت نہایت نفیس ہے قیمت علاوہ محصول عہ

نقاب اٹھ جانے کے بعد

تین افسانون کا مجموعہ جنمین بتایا گیا ہے کہ ہر وہ چیز جو چمکتی ہے سونا نہین زبان و پلاٹ انشاء و تخییل کے لحاظ سے تعریف فضول ہے اور حضرت نیاز کا نام کافی ضمانت ہے قیمت ۵ر علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اسکو شروع کرکے آخر تک پڑھ لینا ہے اس کتاب کی بہت کم جلدین باقی رہ گئی ہین قیمت ۱۲ر علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ مین حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہین ۱۔ چند گمنام فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ ۲۔ مادیین کا مذہب ۳۔ حرکت کے کرشمے نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے قیمت عہ علاوہ محصول

تاریخ الدولتین

جرجی زیدان کے تاریخ تمدن الاسلام کی چوتھی جلد کا ترجمہ جسمین عہد بنی امیہ و بنی عباس کی سیاسیات پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے جرجی زیدان کی یہ کتاب بین الاقوامی شہرت حاصل کرچکی ہے قیمت عہ علاوہ محصول

المسئلۃ الشرقیہ

مصطفیٰ کمال پاشا کی مشہور عالم کتاب کا ترجمہ یہ وہ کتاب ہے جس نے یورپ و ایشیا کی سیاسیات مین ہلچل ڈالدی تھی اور جس نے سب سے پہلے ترکی و مصر، عرب و حجاز مین انقلاب کی روح پھونکی۔ قیمت ۱۲ علاوہ محصول

تذکرۂ خندۂ گل

مؤلفہ عبد الباری آسی جس مین ۳۰۰ صفحات سے زائد اردو و فارسی کے ظریف شاعرون کے حالات معہ انکے لطائف و ظرائف و انتخابات کلام کے درج ہین قیمت عہ محصول ۲ر

دیگر مصنفین کی قابل مطالعہ کتابین

مثنوی لالۂ رخ

طامس مور کی معرکۃ الآرا مثنوی کا مکمل ترجمہ ادبی شاہکار کا بہترین نمونہ قیمت عہ محصول عہ

مثنوی زہر عشق

مرتبہ مجنون گورکھپوری جسمین رنگ کے حاشیہ بہترین اور دیوان کا مقدمہ شامل ہے اور نئی تصویرین دی گئی ہین ایک تصویر رنگین

فراست التحریر مکمل

یعنی اردو و انگریزی رسم خط و دماغ دیکھکر ایک شخص کی سیرت چال چلن مستقبل اور تمام حالات معلوم کرنیکا فن اردو مین بالکل پہلی کتاب قیمت علاوہ محصول

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہوتا ہی
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے۔ ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچروپیہ (عہ) ششماہی تین روپیہ ہے
بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۶	فہرست مضامین جولائی ۱۹۳۴ء	شمارہ ۱

ملاحظات — ۲
ترجمہ کی چند اصولی باتیں — ۹
سکون کی تلاش — طاہرہ دیوی شیرازی — ۱۴
غرائب فلکی اور کائنات کی عظمت — ۲۲
ایک خط — ۲۷
علاج بالغسل — فرید ارشاد — ۳۰
مکتوبات نیاز — ۳۸
ایک دکھیاری لڑکی — حسیب نفیسی — ۴۶
جمود — آرزو جلیلی — ۴۹
بیراگ کا روگ — ۵۲
باب الاستفسار — ۵۸
باب المراسلۃ والمناظرہ — ۶۴
نظیر اکبرآبادی مرحوم — ۷۰
باب الانتقاد — ۷۳
منظومات — عدم۔ روش۔ مجاز۔ اثر۔ فطرت۔ اختر۔ اصغر۔ تپش۔ بہار — ۷۵

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۶	جولائی سنہ ۵۳ء	شمارہ ۱

ملاحظات

مسلمانوں کا یوم النبی ——

مسلمانوں میں ۱۲ ربیع الاول[1] کو وہی اہمیت حاصل ہے جو ہندوؤں کے یہاں جنم اشٹمی کو، یعنی جس طرح ان کے یہاں کرشن جی کی ولادت پر خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے، اسی طرح مسلمانوں کی جماعت ولادت نبوی پر جذبات مسرت ظاہر کرتی ہے

لیکن ان دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے اور وہ یہ کہ جنم اشٹمی کے منائے جانے پر ہندوؤں کے اکابر کی طرف سے نہ کوئی تحریک کی جاتی ہے نہ اخباروں میں نشر و اعلان ہوتا ہے، اور یوم النبی کے لئے علماء اسلام کو کافی پروپاگنڈا کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ مسلمان اس تقریب کی پذیرائی میں زیادہ جوش و ولولہ سے کام لیں، چنانچہ امسال تمام دنیائے اسلامی

---

[1] حالانکہ ولادت نبوی کی صحیح تاریخ ۹ ربیع الاول ہے نہ کہ ۱۲ ربیع الاول۔ دسمبر ۲۲ء کے نگار میں ایک مفصل مضمون اس موضوع پر شائع ہو چکا ہے ۔ من شاء فلیرجع الیہ

کے علما کی طرف سے اعلان شایع کیا گیا اور ہو سکتا ہے کہ اس اعلان کی بنا پر واقعی امسال زیادہ نمود و نمایش سے اس تقریب کو منایا گیا ہو ـــــ لیکن آج جبکہ اس مخصوص دن اور مخصوص تاریخ کو گزرے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا، دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس کے اثرات اب تک کچھ باقی ہیں اور کیا مسلمانوں کی عملی زندگی میں کوئی قابل ذکر تغیر پیدا کرنے میں اس کو کامیابی ہوئی ہے؟

یوم النبی کی تحریک مسلمانوں میں کوئی قدیم تحریک نہیں کیونکہ اس کا پتہ قرون اولی میں کہیں نہیں چلتا - خاص کر لفظ "یوم النبی" تو بالکل مغربی تتبع میں اختیار کیا گیا ہے جو ترجمہ ہے (Prophet day) کا ورنہ اب سے کچھ زمانہ قبل اس کو "ذکر میلاد" "میلاد النبی" اور عوام میں "مولود شریف" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا ـــ لیکن یہ تحریک قدیم ہو یا جدید، اس کا نام "یوم النبی" قرار دیا جائے یا کچھ اور اس کے مفید ہونے سے بہرحال انکار نہیں ہو سکتا اگر واقعی اس سے ہماری عملی زندگی میں کوئی تغیر پیدا ہو، لیکن سوال یہی ہے کہ کیا کبھی اس سے کوئی فائدہ اس قسم کا مترتب ہوا ہے اور کیا آیندہ کوئی توقع اس کی کی جاتی ہے ـــــ مجھے اس باب میں سخت مایوسی ہے اور میرا یقین ہے کہ اگر مسلمان بجائے سالانہ احتفال و اجتماع کے ہر مہینے اور ہر ہفتہ یوم النبی منائیں تو بھی کوئی فائدہ ان کو نہیں پہونچ سکتا - بلکہ جس اسلوب سے اس تقریب میں اظہار جذبات کیا جاتا ہے وہ بجائے مفید ہونے کے اور نقصان رساں ہے

(کسی مذہب میں تہواروں یا خاص خاص تقریبوں کا پیدا ہو جانا) حقیقتاً اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ مذہب اپنے دور انحطاط سے گزر رہا ہے اور اب اس کے پاس سرمایۂ عمل صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ اپنے اسلاف یا اپنی گزشتہ تاریخ عروج کے بعض واقعات کو کبھی کبھی یاد کر لیا کرے - آپ کسی مذہب و قوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس کے ابتدائی زمانۂ عروج میں نہ کوئی خاص تہوار تھا نہ کسی واقعہ کی یاد میں کوئی تقریب منائی جاتی تھی، لیکن جوں جوں اس میں انحطاط پیدا ہوا اس قسم کے مراسم بڑھتے گئے، یہاں تک کہ وہ مجموعۂ روایات سے زیادہ کوئی چیز نہ رہ گیا اور صرف انھیں روایات کا زبانی تحفظ اصل مذہب قرار پایا ـــــ جب کوئی قوم اول اول کسی مقصد کو لے کر پورے جوش کے ساتھ اٹھتی ہے تو اس کے سامنے سوائے اقدام و عمل کے اور کوئی چیز نہیں ہوتی لیکن جب وہ یہ سمجھنے لگتی ہے کہ اس کی فتوحات انتہا کو پہونچ گئیں، یا یہ کہ منزل مقصود اس کو حاصل ہو گئی تو اس کے قوا میں اضمحلال، عزائم میں کمزوری اور عملی زندگی میں ضعف پیدا ہونے لگتا ہے، حتے کہ چند دن تک وہ اسی سطح پر قائم رہنے کے بعد پھر پیچھے کی طرف گرنے لگتی ہے اور تن آسانیوں کی عادت اسے محسوس نہیں ہونے دیتی کہ وہ کس طرح تیزی سے مایل بہ انحطاط ہے ـــــ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں ہر کمال کے لئے زوال ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ جس حالت کو کمال سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ حقیقتاً کمال ہے بھی یا نہیں ـــ دنیا میں ترقی و عروج کی انتہا نہیں، تکمیل و ترقی کی راہیں

غیر محدود ہیں، اس لئے کمال کی تعیین محال ہے، اور زوال کمال کے لئے لازم نہیں ہے بلکہ اس احساس کا نتیجہ ہے کہ ہم نے کمال حاصل کر لیا یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ انحطاط نام ہے تعیین منزل کا اور اس منزل تک پہونچ کر یہ سمجھنے کا کہ اب آگے ہم کو بڑھنا نہیں، لیکن اگر کوئی مقصود متعین نہ کیا جائے یا یہ کہ ہر مدعا کی تکمیل کے بعد، دوسرا مدعا پیش نظر رکھا جائے تو کبھی زوال ہو ہی نہیں سکتا

مسلمانوں کی تاریخ میں خیر عہد رسالت کو تو چھوڑئیے کہ وہ تو بالکل ابتدا ر کا رتھی اور اصولاً اس وقت نہ تعیین منزل کا کوئی سوال پیدا ہو سکتا تھا، نہ تکمیل مدعا کا، لیکن اس کے بعد جب فتوحات وسیع ہوئیں، سلطنت کے حدود میں وسعت پیدا ہوئی، تو کیا ہوا؟ عہد عباسیہ کو عربوں کی فتوحات کا دور زرّیں کہا جاتا ہے، لیکن کیا اس دور زرّیں کے معنے یہ نہ تھے کہ جو کچھ ان کو کرنا تھا کر چکے اور کیا اس احساس میں ان کا زوال پنہاں نہ تھا

اسی طرح ترکوں کو لیجئے کہ اُن کا انتہائی نقطۂ نظر قسطنطنیہ کو فتح کر لینا تھا اور جب محمد خاں ثانی اس میں کامیاب ہو گیا تو اُن کی فتوحات کا بڑھتا ہوا سیلاب اسی جگہ رُک گیا اور اسی دن سے ان کا زوال شروع ہو گیا، ورنہ اگر وہ کسی منزل کی تعیین نہ کرتے اور اپنے اقدامات کو برابر اسی طرح جاری رکھتے تو آج سارا یوروپ مسلمان ہوتا۔ اور سر زمین مغرب کا کوئی حصہ ایسا نہ بچتا جہاں ہلالی پرچم نہ لہرا رہا ہوتا

الغرض قومیں جب آگے بڑھتے بڑھتے ایک جگہ ٹھیر جاتی ہیں، اس وقت سے ان کا زوال شروع ہو جاتا ہے اور پھر جب وہ انحطاط کے اس دور میں پہونچ جاتی ہیں کہ خود ان میں کوئی قوت عمل باقی نہیں رہ جاتی اور نکبت و ذلت کا احساس شروع ہو جاتا ہے تو وہ اپنے اسلاف کے کارناموں کو فخریہ بیان کرنے لگتے ہیں اور اسی کو ذریعۂ ترقی سمجھتے ہیں

یہ ہے حقیقت قوموں کے تہواروں اور تقریبوں کی اور یہی وہ جذبہ ہے جس کے ماتحت مسلمانوں میں بھی بہ سلسلۂ "یوم النبی" اظہار مسرت کیا جاتا ہے

اس میں کلام نہیں کہ رسول اللہ کی ذات گرامی جن صفات کی حامل تھی وہ کبھی فراموش کئے جانے کے قابل نہیں اور نہ ہو سکتے ہیں یہاں تک کہ اگر آج تمام مسلمان دنیا سے محو ہو جائیں تو بھی ان کا ذکر کیا جائے گا اور تاریخ کے صفحات اُن کے اعتراف سے لبریز نظر آئیں گے، لیکن سوال یہ ہے کہ جس اصول و انداز پر اُن کے یوم ولادت کی یاد ہر سال تازہ کی جاتی ہے وہ واقعی ہمارے لئے مفید ہے یا نہیں اور اس وقت تک مسلمانوں کو اس سے کیا فائدہ پہونچا ہے

یہ تقریب آج نہیں بلکہ صدہا سال قبل اس وقت سے منائی جا رہی ہے جب مسلمانوں کی حکومت تھی، لیکن کیا ذکر "میلاد النبی" کے جلسے اس قوم کو انحطاط سے روک سکے اور اب جبکہ زوال کی انتہا ہو چکی ہے کیا یہ اسے اُبھارنے کے ضامن ہو سکتے ہیں؟

تمام عالم اسلامی کے علماء کرام کی طرف سے اعلان شایع ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو "یوم النبی" صد درجہ جوش و اہتمام سے منانا چاہیئے، چنانچہ اس ارشاد کی تعمیل میں اونچے اونچے دروازے نصب کئے جاتے ہیں، رنگین جھنڈیوں سے در و دیوار کی آرائش ہوتی ہے، بجلی کے قمقمے لٹکائے جاتے ہیں، شیرینی کا انتظام ہوتا ہے، نوجوانوں کے گروہ ہاتھوں میں جھنڈے لئے، سینے پر ریشمی کپڑوں کے بیج لگائے اللہ اکبر کے پر زور نعرے مارتے ہوئے نکلتے ہیں، اور رات کو جب واعظ اپنا وعظ ختم کر چکتا ہے تو شیرینی لے لے کر لوگ اپنے گھر واپس آتے ہیں، اس حال میں کہ رات بھر وہ اس جنت کا خواب دیکھتے رہتے ہیں جس کا ذکر واعظ نے کیا تھا اور صبح کو جب بیدار ہوتے ہیں تو کاہلی و بیکاری کا وہی جمود ان پر طاری ہوتا ہے جو اس سے قبل طاری تھا اور کسی قسم کا کوئی اضافہ اپنی ہمت و جرأت میں نہیں پاتے۔

اسلاف پرستی یقیناً اچھی چیز ہے اور قوموں کو ابھارنے کے لئے یہ ذریعہ بلاشک کارآمد ثابت ہو سکتا ہے، لیکن اسلاف پرستی کا جو مفہوم عام طور پر لیا جاتا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا سکندر کے مرنے کے بعد محض اس کی یاد سلطنت روما کو تباہی سے بچا سکی، کیا سلطان محمد ثانی اور سلیمان اعظم کے کارناموں کا ذکر سلطنت ترکی کو زوال سے بچا سکا، کیا عبدالرحمان کی جرأت و ہمت کی داستانیں ہسپانیہ میں مسلمانوں کی حکومت کو زوال سے روک سکیں ——— اکاسرہ عجم کی شوکت و جبروت کا ذکر ہر ایرانی کے لب پر تھا لیکن ایران تباہ ہو کر رہا، رام و کرشن کے ولولہ و عزم کی کہانیاں ہمیشہ سے ہندوؤں کو یاد تھیں لیکن مسلمانوں نے ان کو مغلوب کر کے چھوڑا، سطوت مغلیہ کے آوازہ سے فضا گونج ہی رہی تھی کہ انگریزوں نے آکر تختہ کا تختہ الٹ دیا ——— پھر یاد رکھو کہ تم ہر سال کیا معنی اگر ہر مہینے "یوم النبی" منا کر رسول اللہ کی ولادت پر اظہار مسرت کرتے رہو گے تو بھی مٹنے سے نہیں بچ سکتے، کیونکہ قوموں کے عروج و زوال کا ہمیشہ ایک ہی فلسفہ رہا ہے اور جب تک کوئی نپولین و ہنی بال پیدا نہ ہو جائے محض ان کی یاد کوئی معنی نہیں رکھتی ——— پھر یہ وقت رستم و سہراب کی داستانیں دہرانے کا نہیں بلکہ رضا شاہ کے پیدا کرنے کا ہے، باب عالی کی گزشتہ سطوت و جبروت بیان کرنے کا نہیں، بلکہ مصطفیٰ کمال کے وجود میں لانے کا ہے، اور اگر روس کی لعنت استبداد کو دور کرنے کے لئے لینن ہی کی ضرورت تھی، اگر اطالیہ کو حضیض سے نکال کر بلندی پر لانے کے لئے کوئی مسولینی ہی درکار تھا، اور جرمنی میں نئی زندگی پیدا کرنے کے لئے ہٹلر کا پیدا ہونا لازم تھا، تو یاد رکھو ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی روح پھونکنے کے لئے کسی نہ کسی خالد و عمر، حسین و علی کا ظہور میں آنا ضروری ہے، اور وہ نہ کسی احتفال و اجتماع سے پیدا ہو سکتے ہیں، نہ وعظ و تبلیغ سے، بلکہ اپنے آپ کو طوفان میں ڈال دینے سے، آگ کے اندر کود جانے سے اور ہتھیلی پر سر لے کر نکل پڑنے سے

رسول کی ولادت و سیرۃ کا ذکر کیا جاتا ہے ——— اس رسول کا جس کی زندگی یکسر عمل، سراپا ایثار و قربانی تھی، اس ہستی کا جس میں سوائے صداقت و خلوص کے نمود و نمایش کا کہیں پتہ نہ تھا، اس ذات گرامی کا جو صرف ہمدردی

و محبت کے لئے وضع ہوئی تھی - لیکن حال یہ ہے کہ سوائے قول کے عمل کا کہیں نام نہیں ، بجز نمود و نمائش کے صداقت کا کوسوں پتہ نہیں ، سوائے خود غرضی و طمع نفس کے ایثار و قربانی سے کوئی واسطہ نہیں ـــــــ پھر خدارا کوئی بتائے کہ یہ کیا تماشہ ہے ، یہ کس قسم کی یادگار ہے ، یہ کس انداز کا اجتماع قومی ہے اور ہمارے علمائے کرام ، ہمارے قائدین عظام اس سے کس فائدہ کی توقع رکھتے ہیں

اگر اسوۂ رسول کی عظمت کو ہم صرف رنگین جھنڈیوں سے ظاہر کر سکتے ہیں ، اگر اس کی پاکیزہ سیرت کے اظہار میں صرف بجلی کے قمقموں کا روشن کرنا کافی ہے ، اگر اس کی مقدس تعلیم کا نشر و اعلان محض شیرینی تقسیم کرنے سے پورا ہو سکتا ہے اور اگر ہم اس کے باطنی و اخلاقی علو کو جھنڈے لے کر سڑکوں پر گشت لگانے سے ثابت کر سکتے ہیں ، اور اگر اس کی صداقت عمل کی تبلیغ میں ظاہری نمود و نمائش کے علاوہ کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ، تو بے شک یہ سب کچھ درست ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ لہو و لعب کا مظاہرہ نامناسب نہیں ، لیکن اگر خود رسول نے کبھی وہ نہیں کیا جو ہم کر رہے ہیں اور کبھی اس کی اجازت نہیں دی جو ہماری طرف سے ظاہر ہو رہا ہے تو پھر اس کو "یوم النبی" کی یادگار کہنا یقیناً رسول اللہ کی توہین ہے ، اسلام کی تذلیل ہے اور مسلمانوں کے اندر اک ایسے جذبہ کی پرورش کرنا ہے جو بت پرستی کی طرف تو منجر ہو سکتا ہے لیکن خدا پرستی سے اسے کوئی تعلق نہیں

یہ تو ہوئی عملی پہلو کی کمزوری یا اس کا فقدان جو یوم النبی کے سلسلہ میں مسلمانوں کی طرف سے ظاہر ہوتا ہے ، اب رہ گئی تاریخی یا مذہبی حیثیت جس کو سامنے رکھ کر ہمارے علمائے کرام ذکر میلاد فرماتے ہیں ، سو اس کا خیال اس سے بھی بدتر ہے - کیونکہ ان کا مقصود رسول اللہ کو ایک انسان کی حیثیت سے پیش کرنا کبھی نہیں ہوتا ، بلکہ ایک مافوق الفطرت ہستی کی صورت سے پیش کرنا ہوتا ہے ـــــــ وہ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے کہ ان کا نور لاکھوں سال قبل سے خدا جانے کہاں کہاں چکر کھاتا پھرتا ہے ، وہ جس وقت پیدا ہوتے ہیں تو اکاسرہ کے محل اور صنمکدوں کے بت سرنگوں ہو جاتے ہیں ، وہ ابھی عالم طفلی میں ہوتے ہیں کہ فرشتہ ان کا سینہ چاک کر کے آلائش سے پاک کر دیتا ہے ، وہ دعوائے نبوت کرتے ہیں تو سنگریزے اس کی شہادت دیتے ہیں ، جب آپ چلتے ہیں تو جسم کا سایہ نظر نہیں آتا ، اور اگر کبھی جوشش نبوت میں انگلی کا اشارہ کر دیتے ہیں تو چاند کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں ، پھر میں حیران ہوں کہ جب ذکر میلاد کے سلسلہ میں قولاً و عملاً کوئی بات بھی کام کی نہیں ہوتی تو کیوں کر اسیر ہزاروں روپیہ ضائع کیا جاتا ہے اور کیوں اس طرح کے ظاہری مراسم و شعائر کی طرف متوجہ کر کے ان کے قوائے عمل کو اور ضعیف بنایا جاتا ہے

اس وقت سب سے ضروری امر جس کی طرف اکابر اسلام کو توجہ کرنا ہے ، وہ مسلمانوں کی اقتصادی کمزوری ہے ، جو نمازیں پڑھنے سے دور ہو سکتی ہے نہ یوم النبی منانے سے بلکہ صرف ایک ایسی تنظیم سے جو ان کی معاشرت و معیشت کو اجتماعی طور پر اپنے ہاتھ میں لے لے ـــ اور یہ نہایت آسانی سے ممکن ہے اگر ہمارے یہاں کے علماء و اکابر

صرف زکوٰۃ کے مسئلہ پر توجہ کرکے ایک قومی بیت المال قائم کرسکیں - لیکن ہمیں معلوم ہے کہ ان کی تن آسانیاں اور خود غرضیاں کبھی اس کی اجازت نہ دیں گی اور وہ "یوم النبی" کی تقریب میں مقالاً مزخرفات کا ایک طومار اور عملاً لہو و لعب کا دلچسپ پروگرام تو ضرور پیش کرسکیں گے لیکن کام کی کوئی بات کبھی نہ کریں گے

اس وقت مسلمانوں کی ۸ کروڑ آبادی میں سے اگر ایک کروڑ مسلمان بھی اوسطاً ایک روپیہ سالانہ دینے والے مل جائیں اور یہ رقم ایک جگہ جمع ہوکر قومی اداروں میں صرف ہو تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایک ربع صدی کے اندر کتنا عظیم انقلاب برپا ہوسکتا ہے اور فقر و فاقہ و بیکاری کی وہ لعنت جس میں مسلمانوں کی اکثر تعداد مبتلا نظر آتی ہے کتنی آسانی سے دور ہوسکتی ہے

یوم النبی کی تقریب ہندوستان کے ہر گاؤں، ہر قصبہ، اور شہر کے ہر ہر محلہ میں منائی جاتی ہے اور اس لئے اس سے بہتر کوئی موقعہ عام تنظیم کے لئے نہیں ہوسکتا - ہر محلہ میں ایک ایک کمیٹی چند آدمیوں کی بنادی جائے جو ماہوار وصولی زکوٰۃ کے ذمہ دار ہوں اور ان کمیٹیوں کا تعلق شہر کی صدر کمیٹی سے ہو - اسی طرح شہروں کی کمیٹیاں صوبہ کی مرکزی کمیٹی سے متعلق ہوں اور صوبوں کی کمیٹیاں بیت المال عمومی سے وابستہ ہوں جو سارے ملک کا ایک ہوگا ——— اس کا سالانہ جلسہ ہر جگہ یوم النبی کی تقریب میں منعقد کیا جائے اور رپورٹ پیش کی جائے کہ سب کمیٹیوں نے سال بھر میں کیا کام کیا اور یہ تمام رپورٹیں بیت المال عمومی کے صدر کے پاس جائیں گی جو ایک بورڈ کے مشورہ سے ہدایات جاری کرے گا - ہر محلہ کے مستحقین امداد کی فہرست باقاعدہ مرتب کی جائے اور ایک خاص حد تک شہر کی کمیٹی کو خرچ و امداد کے اختیارات دیئے جائیں

الغرض یہ اور اسی طرح کی بہت سی صورتیں اس سلسلہ میں ایسی پیدا ہوسکتی ہیں جو مسلمانوں کے بہت سے نادار طلبہ کو تعلیم دلانے میں مدد دے سکتی ہیں - اور خدا جانے کتنے صنعتی مدارس اور تجارتی ادارے قائم کرکے لاکھوں بیکار مسلمانوں کو کام میں لگایا جاسکتا ہے - مگر ہمارے اکابر کو کیا غرض ہے کہ وہ اس طرف توجہ کریں اور ہمارے علماء کرام کو کیا پڑی ہے کہ وہ یہ دردسر مول لیں، جبکہ ان کی زندگی یوں ہی لطف و مسرت سے بسر ہو رہی ہے

سنا تھا کہ صوبہ بہار میں امارت شرعیہ قائم ہوئی تھی اور غالباً اب بھی باوجود زلزلہ کی تباہکاریوں کے صرف اس لئے باقی ہے کہ مسجدوں کی تعمیر و مرمت کے لئے چندہ فراہم کرسکے، لیکن ہمیں نہیں معلوم کہ سوائے مسائل شرعیہ بتانے اور جواز و عدم جواز کا فتویٰ دینے کے کوئی کام اس نے اصلاح قومی کا کیا ہو، یا مسلمانوں کی اقتصادی حالت پر کبھی غور کرنے کی توفیق اس کو ہوئی ہو - پھر جب ہمارے یہاں کے اکابر مذہب کی ذہنیت کا یہ عالم ہو اور ان کا فرض اس سے زیادہ اور کچھ نہ ہو کہ جب کنوئیں میں چوہا یا بلی گرجائے تو وہ یہ بتادیں کہ اتنے

ڈول پانی نکالنے سے وہ پاک ہو جاتا ہے، تو اپنے مستقبل کے متعلق خاک کوئی توقع قائم ہو سکتی ہے اور پامال و فنا ہونے سے ہم کو کون سی قوت محفوظ رکھ سکتی ہے۔

جنوری ۳۵ء کے نگار کی طیاریاں ابھی سے ہو رہی ہیں۔ یعنی ملک کے ارباب قلم کو ابھی سے متوجہ کیا جا رہا ہے اور اس وقت تک جتنے خطوط موصول ہوئے ہیں اُن کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالباً ہمیں اپنے مساعی کے نامشکور رہنے کی شکایت نہ کرنا پڑے۔ اور ہم اپنے ارادہ کے مطابق اس کو ہر نوع بہترین تکمیل کے ساتھ پیش کر سکیں

دہلی و لکھنؤ اسکول کی شاعری کے متعلق اس سے قبل بارہا لوگوں نے لکھا ہے، لیکن یکجائی طور پر اتنا بہتر مجموعۂ تنقید غالباً آپ کو کہیں نہ مل سکے گا۔ اور نہ اتنے متنوع مباحث پر اس سلسلہ میں رائے زنی کی گئی ہو

ہم چاہتے ہیں کہ اس موضوع پر نگار کا یہ نمبر "لفظ آخریں" کی حیثیت سے شایع ہو، لیکن ظاہر ہے کہ اس میں صرف اسی وقت کامیابی ہو سکتی ہے۔ جب ملک کے تمام قابل ذکر اہل قلم، مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے تمام مسائل پر روشنی ڈالیں۔ اور ہمیں اُمید ہے کہ ہم ان کو اس طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوں گے

ضخامت کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا، اور نہ ہو سکتا ہے کیونکہ اگر بہتر مضامین ہم کو موصول ہوتے رہے تو ہم صفحات بڑھاتے جائیں گے خواہ اس کی تعداد سیکڑوں تک پہونچ جائے

یہ خبر غالباً مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ ہمارے عزیز دوست مجنوں گورکھپوری نے ایوان اشاعت میں پھر رُوح پھونکی ہے اور کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ایوان کا اجرا بھی غالباً بہت جلد ہونے والا ہے

اس مرتبہ انھوں نے اپنے یہاں کے قواعد میں کچھ تبدیلیاں کر دی ہیں تاکہ لوگ آسانی سے مستفید ہو سکیں اس لئے ہمیں امید ہے کہ اہل ذوق جناب مجنوں سے جدید قواعد طلب کر کے اس ادارۂ علم و ادب کی ہر ممکن خدمت انجام دیں گے

بہترین طباعت

اگر آپ چاہتے ہیں تو "مختار پرنٹنگ ورکس" سے خط و کتابت کیجئے

مینجر نگار لکھنؤ

ترجمہ کے متعلق چند اصولی باتیں

چونکہ اُردو زبان ابھی تک دورِ تراجم سے نہیں گزری ہے، اس لئے یہ بحث کبھی نہ کبھی ضرور دیکھنے میں آجاتی ہے کہ غیر زبانوں کے الفاظ کا ترجمہ کس اصول سے کیا جائے ـــــــ کوئی کہتا ہے کہ ٹھیٹ ہندی کے الفاظ استعمال کئے جائیں اور کوئی عربی و فارسی سے مدد لینا ضروری سمجھتا ہے ـــــــ اس میں شک نہیں کہ جس حد تک صرف معمولی قصّے کہانی کی کتابوں کا تعلق ہے۔ آپ بآسانی ہندی بھاشا سے کام نکال سکتے ہیں، لیکن جس وقت سوال علمی کتابوں کا آئے گا تو آپ مجبور ہوں گے کہ یا تو عربی فارسی سے مدد لیں یا سنسکرت سے، کیونکہ اُردو زبان معمولی روز کی گفتگو کے لئے ایجاد ہوئی تھی اور اس میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ مطالب عالیہ یا مصطلحات علمیہ کے لئے الفاظ پیش کر سکے، اس لئے جب غیر زبانوں کے ترجمہ کی ضرورت ہوتی ہے تو اُردو داں طبقہ پریشان ہو جاتا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے

ہر چند بعض کتابیں مصطلحات علمیہ کی لکھی جا چکی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک کوئی اصولی گفتگو اس موضوع پر نہیں ہوئی اور نہ کوئی ایسا فیصلہ ہو سکا جس کو سامنے رکھ کر ہم ترجمہ کی دشواریوں کو دُور کر سکیں

انجمن ترقی اُردو اور جامعہ عثمانیہ کی خدمات اس باب میں یقیناً قابل قدر ہیں اور اس وقت تک وہاں سے متعدد علوم و فنون کی کتابوں کا ترجمہ اردو زبان میں ہو چکا ہے، لیکن افسوس ہے کہ تمام ترجمے کسی ایک اصول کے ماتحت نہیں کئے گئے اور ارباب قلم کی وہ تشویش جو اصول سے متعلق تھی ہنوز باقی ہے

انجمن ترقی نے جو لغت مصطلحات کا مرتب کیا ہے وہ ناقص و نامکمل تو خیر ہے ہی، افسوس یہ ہے کہ جتنا کچھ اس میں ہے وہ بھی کسی اصول کے ماتحت نہیں ہے، کسی جگہ تو آپ دیکھیں گے کہ انھوں نے خالص ہندی بلکہ سنسکرت کے الفاظ لے لئے ہیں اور کسی جگہ عربی کے ثقیل مصطلحات لینے میں بھی دریغ نہیں کیا۔ یہ امر طے شدہ ہے کہ اُردو علمی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لئے ہم کو غیر زبانوں کے الفاظ لینا ضروری ہیں، اس لئے اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ الفاظ کس زبان سے لئے جائیں، عربی سے یا سنسکرت سے۔

سنسکرت سے مصطلحات مستعار لینا گناہ نہیں لیکن چونکہ ہندوستان کی اکثر آبادی کو اس زبان سے تعلق نہیں رہا ہے۔ اور عربی سے وہ بڑی حد تک مانوس ہیں یہاں تک کہ دیہاتیوں کی زبان میں بھی کثرت سے عربی کے الفاظ پائے جاتے ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ عربی سے مدد نہ لی جائے۔ پھر اسی کے ساتھ جب آپ تصریفی آسانیوں کو دیکھیں گے تو لامحالہ سنسکرت پر عربی کو ترجیح دی جائے گی، اور یوں بھی اس وقت تک علوم و فنون کی جتنی کتابیں عربی میں آچکی ہیں، سنسکرت یا بھاشا میں منتقل نہیں ہو سکیں

بہرحال چونکہ ترجمہ کا مسئلہ ایک اہم مسئلہ ہے اور میں نے ہمیشہ عربی سے مدد لینے کو مرجح سمجھا ہے اس لئے آج کی صحبت میں مختصراً بتانا چاہتا ہوں کہ خود عربی میں ترجمہ کے کیا اصول ہیں، ممکن ہے کسی حد تک مفید ثابت ہوں

پہلا اصول تو یہ ہے کہ جب تک انھیں عربی الفاظ ملتے ہیں وہ عجمی الفاظ کا ترجمہ اپنی ہی زبان کے مترادف الفاظ میں کرتے ہیں۔ البتہ وہ عربی الفاظ میں اُن تمام الفاظ کو شامل کرتے ہیں جو اُن کے لغت و ادب میں اوزان عربیہ پر جاری ہیں خواہ اُن کی اصل کچھ ہو—— مثلاً قلم کہ دراصل یونانی لفظ ہے لیکن چونکہ اُن کے لغت میں رائج ہے اس لئے اسے وہ عربی سمجھتے ہیں، یا ابریق کہ فارسی الاصل ہے، یا قیس کہ سریانی کا لفظ ہے یا سلطان کہ قبطی الاصل ہے یا مشکاۃ کہ حبشی الاصل ہے سب عربی کے الفاظ سمجھے جاتے ہیں۔ پھر وہ اوزان عربیہ کا بھی زیادہ لحاظ نہیں کرتے بلکہ زیادہ تر استعمال و رواج کو دیکھتے ہیں اور اسی لئے جند بیدستر، سالامندرا اور قنطاریون ایسے الفاظ بھی اُن کے نزدیک عربی کے الفاظ ہیں

اس قاعدہ میں ان کے یہاں بہت کم استثنائی مثالیں مل سکیں گی اور افعال میں تو بالکل نہیں کیونکہ وہ غیر زبان کے افعال کبھی استعمال نہیں کرتے —— اسی طرح حروف میں بھی کوئی مستثنیٰ نہیں ہے بجز (de) فرانسیسی (of) انگریزی اور (von) جرمنی کے، کہ یہ سب حروف اضافی ہیں اور عربی میں ان کی ضرورت نہیں لیکن صرف اس لئے کہ التباس پیدا نہ ہو اور لوگ آسانی سے سمجھ سکیں، کیونکہ اگر بجائے پرنس آف ویلس کے پرنس ویلس لکھیں تو ممکن ہے لوگوں کو سمجھنے میں زحمت ہو

اسماء میں بیشک شواذ کثرت سے پائے جاتے ہیں اور بعض اعجمی الفاظ اس طرح داخل ہو ہیں کہ اگر ان کا ترجمہ کیا جائے تو اصل مفہوم پوری طرح واضح نہیں ہو سکتا مثلاً لفظ پرنس کو لیجئے، کہ اس کا ترجمہ عربی میں لفظ امیر سے کیا جاتا ہے، لیکن پرنس آف ویلس کا ترجمہ امیر ویلس یا امیر آف ویلس نہیں کریں گے کیونکہ اس طرح معنی پر صریح دلالت نہیں ہوتی۔ چونکہ ترجمہ کا اصل مقصود یہ ہے کہ کم سے کم..... وقت اور الفاظ میں سامع ہمارے مدعا کو سمجھ سکے اس لئے اعجمی الفاظ بجنسہ لے لینے میں وہ کبھی احتراز نہیں کرتے اگر ضرورت اس کی ناشی ہوتی ہے —— ابن مذکور سے بہت پہلے ابن اثیر، ابن سینا اور ابن بیطار بھی ایسے اعجمی الفاظ کو جو کثرت سے رائج

ہو گئے تھے اور جو اپنے مفہوم کو زیادہ آسانی کے ساتھ ادا کر سکتے تھے ۔ لے لیتے تھے اور اس کا ترجمہ عربی میں نہ کرتے تھے۔ لیکن اگر کسی التباس کا اندیشہ نہیں ہوتا تو بیشک عربی میں ترجمہ کرتے تھے اور اب بھی یہی دستور ہے، چنانچہ "پرنسات اور وبا" کبھی نہیں لکھیں گے بلکہ "امرار اروبا" لکھیں گے

الغرض ان کا مقصود ترجمہ سے یہ ہوتا ہے کہ اصل مدعا فوراً سمجھ لیا جائے اور اس غرض کے لئے وہ عجمی الفاظ لینے میں کبھی تامل نہیں کرتے مثلاً (*Rheumatism*) کو لیجئے کہ اب عربی میں زیادہ تر اس کو "روماتزم" کہتے ہیں حالانکہ اس کے لئے عربی مرادف لفظ "داء المفاصل" یا "وجع المفاصل" موجود ہے لیکن چونکہ داء المفاصل سے عام طور پر ہاتھ پاؤں کے جوڑوں کا درد سمجھ میں آتا ہے اور پیٹھ کی طرف خیال نہیں جاتا اس لئے انھوں نے روماتزم جوں کا توں اپنے یہاں لے لیا۔ اسی مصلحت سے وہ بجائے توتیا کے زنک اور بجائے نشادر کے امونیا لکھتے ہیں

دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی اعجمی لفظ کا صحیح مترادف لفظ عربی میں نہیں ملتا ہے تو پھر یہ جستجو کی جاتی ہے کہ قریب قریب یہ مفہوم کس لفظ سے ادا ہو سکتا ہے اور اگر کوئی لفظ ایسا مل گیا تو اسے اختیار کر لیتے ہیں ــــ مثلاً انگریزی لفظ "*Mercenaries*" ہے۔ اس سے مراد وہ افواج ہیں جو دوسرے ممالک سے مستعار لی جاتی ہیں۔ اب انھوں نے سوچا کہ یہ رسم یقیناً عربوں میں بھی رہی ہوگی۔ اور ضرور اس کے لئے کوئی لفظ استعمال کرتے ہوں گے، چنانچہ جستجو سے ان میں لفظ "مسترزقہ" ملا جو ایسی فوجوں کے لئے استعمال ہوتا تھا اور وہ انھوں نے اختیار کر لیا ــــ اسی طرح ایک اور انگریزی لفظ "*Tributory*" ہے جس سے مراد وہ چھوٹی ندی ہے جو کسی دریا میں جا کر گرتی ہے، اس کے لئے جب انھوں نے قدیم سفرنامے اپنے یہاں کے دیکھے تو معلوم ہوا کہ اس کے لئے لفظ ناصر استعمال کیا گیا ہے جس کی جمع نواصر آتی ہے، اس لئے انھوں نے اس کو اختیار کر لیا ــــ اگر کوئی ایسا عجمی یا عامی لفظ ہوتا ہے جس کی عربی زیادہ رائج نہیں ہے تو بدستور وہی لفظ باقی رکھا جاتا ہے مثلاً مصر میں لفظ لقاوی کثرت سے مستعمل ہے اور عربی لفظ بذار کوئی استعمال نہیں کرتا، اسی طرح مذبح کو سلاخ بلدی کہنے کا رواج ہے اور زبل کوئی نہیں کہتا، پابل کو بجائے جسر کہنے کے کبری کہتے ہیں اور ڈاک کو بجائے برید کے بوسطہ، تو انھوں نے انھیں رواجی الفاظ کو لے لیا، کیونکہ وہ زیادہ قریب الفہم ہیں اور عام و خاص سب انھیں آسانی سے سمجھ لیتے ہیں

تیسرا قاعدہ عجمی ناموں کے متعلق ہے اور وہ یہ کہ جو نام جس طرح سے عربی میں رائج ہیں ان کو بدستور اسی حال پر رکھا گیا خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید، مثلاً ابراہیم، یوسف، المانیا، امیرکا وغیرہ اور جو نام نئے آتے ہیں ان کو تلفظ کے لحاظ سے لکھتے ہیں ــــ شہروں کے بعض نام ایسے ہیں جو زمانہ قدیم سے عربی میں چلے

آ رہے ہیں جیسے وینس کے لئے بندقیہ، سسلی کے لئے صقلیہ سو اس کے لئے انھوں نے یہ کیا ہے کہ جب وہ کسی واقعۂ تاریخی کا ذکر کریں گے تو وہی بندقیہ و صقلیہ استعمال کریں گے، لیکن جب زراعت و صناعت حالیہ کے متعلق کچھ لکھنا ہوگا تو وہ وینس و سسلی ہی لکھیں گے، کیونکہ اہل حرفت و پیشہ میں یہی زیادہ رائج ہیں

بعض نام ایسے ہیں جو فی الاصل عربی ہیں لیکن اہل مغرب نے ان کی صورت میں تبدیلی پیدا کر دی ہے، سو ان کو اسی اصلی صورت میں لکھا جاتا ہے۔ اور اہل افرنج کے تصرفات کو قبول نہیں کیا جاتا۔ مثلاً قاہرہ، قرطبہ، اشبیلیہ کہ اس کو کیرو۔ کارڈووا اور سیول وہ کبھی نہ لکھیں گے

چوتھا قاعدہ، الفاظ جدیدہ کے ترجمہ کرنے کا یہ ہے کہ اگر انھیں کوئی لفظ عربی کا ایسا مل جاتا ہے جو پہلے سے اس معنی میں رائج ہے تو پھر وہ اسی کو اختیار کر لیتے ہیں مثلاً اکسجین، ہدروجین، نیتروجین اور فضفور وغیرہ بلکہ اسی سے افعال بھی بنا لیتے ہیں مثلاً مغنطیس سے انھوں نے مغنط فعل بنایا اور کہربا سے کہرب۔ لیکن اگر کوئی لفظ رائج شدہ انھیں نہیں ملتا تو وہ تھوڑی تبدیلی کے ساتھ نئے لفظ کو اپنی زبان میں لے لیتے ہیں جیسے تلفون، فونوغراف، مکروفون، اتوموبیل اور کبھی کبھی کوئی دوسرا عربی لفظ بھی گھڑ لیتے ہیں جیسے اتوموبیل کے لئے سیارہ کہ اب عام طور پر یہی مستعمل ہے

اول اول جب بیروت میں بائسکل آئی تو اس کا ایک پہیہ بہت بڑا تھا، دوسرا بہت چھوٹا اور سوار ہونے میں بڑی زحمت ہوتی تھی، لوگوں نے سمجھ لیا کہ یہ ٹرائسکل (تین پہیوں والی گاڑی) کے مقابلہ میں یہ چلنے والی چیز نہیں ہے اس لئے انھوں نے لفظ بائسکل اختیار کرنے سے احتراز کیا اور دراجہ کا لفظ اختراع کیا، بعد کو جب دو پہیوں والی گاڑی کے لئے بائسکل اور تین پہیوں والی کے لئے ٹرائسکل کا لفظ وضع ہوا تو اہل مصر نے دراجہ کو چھوڑ کر عجلہ کا لفظ وضع کیا جو دونوں پر حاوی تھا

مصطلحات علمی میں چونکہ تعریب کا بہت کم موقعہ ہے اور ذرا ذرا سے تغیر سے معنے میں بہت اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے انھوں نے اس باب میں بھی علماء کا تتبع کیا اور جوں کا توں لے لیا۔

اب معنی کے لحاظ سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یا تو وہ حقیقی ہوں یا مجازی، اور اہل عرب کے نزدیک مالوف ہوں گے یا غیر مالوف۔ پس اگر وہ حقیقی ہیں اور مالوف بھی ہیں (مثلاً گھوڑے پر چڑھنے کو وہ رکوب کہتے ہیں اور شراب پینے کو شرب) تو اس قبیل کے معنے جہاں جہاں آئیں گے وہ یہی افعال استعمال کریں گے۔ اگر معنی حقیقی ہیں اور غیر مالوف تو ترجمہ لفظی کرتے ہیں۔ یا قریب قریب لفظی کے مثلاً بندوق سر کرنے کے لئے وہ لفظ اطلاق استعمال کرتے ہیں اور بم وغیرہ کے لئے رمی

اگر معنی مجازی ہوتے ہیں اور مالوف تو بھی کوئی دقت نہیں ہوتی۔ اور اُسے اختیار کر لیتے ہیں جیسے فتنہ

جگانے کے لئے " ایقاظ الفتنہ "

اگر معنی مجازی ہوتے ہیں اور غیر مالوف تو وہ اس قبیل کے استعارات کو اپنی زبان میں تلاش کرتے ہیں اگر قریب قریب اس کے مل گئے تو انھیں لے لیتے ہیں ورنہ پھر اس غیر زبان کے استعارہ کو استعمال کرنے لگتے ہیں ——— الغرض اہل عرب کے تمام اصول ترجمہ کے متعلق آسانی کے خیال پر قائم کئے گئے ہیں اور وہ دوسری زبان کے الفاظ لینے میں بھی تامل نہیں کرتے، اس لئے اگر اردو میں بھی انھیں اصول پر کاربند ہوں تو کیا حرج ہے، یعنی غیر زبان کے وہ الفاظ جو رائج ہو چکے ہیں ان کو جوں کا توں رہنے دیں اور مصطلحات علمیہ یا دوسرے بلند مفہوم کے الفاظ کا ترجمہ کرنے میں وہ اپنی زبان میں جستجو کریں اگر کوئی لفظ پورے معنی پر حاوی مل جائے تو لے لیں - اور اگر کسی غیر زبان سے استعارہ کی ضرورت ہے تو عربی فارسی سے مدد لیں

ہر چند اس صورت میں عربی فارسی کا علم ضروری ہوگا - اور ہر شخص ترجمہ نہ کر سکے گا، لیکن اگر سنسکرت یا بھاشا کے ثقیل الفاظ لئے گئے تو اُن کے لئے سنسکرت دانی کی ضرورت ہوگی، اور یہ امر ظاہر ہے کہ ہم لوگوں کے لئے فارسی عربی کا سیکھنا اتنا دشوار نہیں ہے جتنا سنسکرت کا ———

گلہائے جعفری

یعنی مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے کلام کا انتخاب از نیاز فتح پوری - ابتدا میں جناب نیاز نے مختصراً لکھنوی شاعری پر تبصرہ کیا ہے - ۵ر کے ٹکٹ بھیجکر حاصل کیجئے

شوپنہار

فلسفۂ شوپنہار پر ایک بے مثل تبصرہ ۱۲ر (علاوہ محصول)

مثنوی زہر عشق

مجلد مع رنگین تصاویر و تین مقدمات قیمت ۱۲ر (علاوہ محصول)

مینیجر نگار لکھنؤ

سکون کی جستجو

طاہرہ دیوی شیرازی کا یہ دوسرا افسانہ ہے جو نگار میں شایع ہو رہا ہے، آپ نسباً ہندو اور ازدواجاً مسلمان ہیں، لیکن اعتقاد کے لحاظ سے بالکل میرے خیالات کی ہمنوا ہیں

یہ افسانہ، فن کے لحاظ سے اُردو میں اس ارتقائی درجہ کی چیز ہے، جہاں مردوں کا دماغ بھی مشکل ہی سے پہونچ سکتا ہے چہ جائیکہ عورتیں

طاہرہ دیوی نہ صرف فارسی بلکہ فرانسیسی زبان کی بھی ماہر ہیں۔ اور غالباً یہیں سے یہ معمہ حل ہوتا ہے کہ اُن کی افسانہ نگاری میں یہ رنگ کہاں سے آیا ——

زبان کی صفائی و شگفتگی کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بنگال کی ایک ہندو خاتون اتنی صاف و صحیح اُردو لکھنے میں کیونکر کامیاب ہو سکیں،

اُمید ہے کہ نگار میں اُن کے افسانے برابر شایع ہوتے رہیں گے۔ اور کسی آیندہ اشاعت میں ہم ان کی تصویر بھی پیش کر سکیں گے ——

نیاز

گلفام کی بابت سب کو یقین ہو چلا تھا کہ اب اس کی زندگی کے دن پورے ہو گئے ہیں۔ اور اس دنیا میں وہ صرف چند دن کا مہمان ہے۔ اصطبل میں تھان کے سامنے لیٹے لیٹے اس کو کامل ایک ہفتہ گذر چکا تھا۔ مالک بھی اس کی خراب حالت دیکھتے دیکھتے تنگ آگیا تھا۔ کئی بار اس نے ارادہ کیا کہ گولی کا نشانہ بنا کر اس کی تکلیفوں کو ختم کر دے۔ مگر دیرینہ رفاقت کا احساس اسے ہر مرتبہ باز رکھتا تھا۔ وہ روز اس خیال سے خاموش ہو جاتا کہ آج نہیں تو کل ضرور مر جائے گا۔ مرتے ہوئے کو مارنے سے کیا فائدہ۔ اس کی چاروں ٹانگیں بیکار ہو چکی تھیں۔ رانوں تک کا گوشت سڑ چکا تھا۔ جب ان میں کیڑے کلبلاتے تو درد کی شدت سے وہ بھیانک آواز سے ہنہنانے لگتا۔ اکثر رات کے وقت اس کے کراہنے کی آواز سے سوتے ہوئے لوگوں کی نیند خراب ہو جاتی مالک جھنجھلا کر پستول لے کر اٹھتا مگر طویلہ تک جا کر رہ جاتا۔ اسے اندر جاتے ہوئے بھی کراہت معلوم ہوتی تھی۔ وہاں کی تمام

فضا زخموں کی عفونت سے ناقابل برداشت ہو گئی تھی - وہ صرف جھانک کر دیکھتا اور واپس لوٹ آتا - دل ہی دل میں رائے قائم کرتا کہ صبح تک ضرور مر جائے گا

گھر کے پلے ہوئے شکاری کتے اس کے پاس آتے، زخموں کو سونگھتے، اور اُن پہ پیشاب کر کے غریب بے زبان جانور کو اور زیادہ تکلیف پہونچاتے - کبھی کبھی بکرے کے سینگ بھی اس کی مجروح کھال پر عمل جراحی کی مشق کرتے - مگر وہ انتقام لینے سے قاصر تھا - رات کے وقت چوہے نکل کر اس کے کان کاٹتے، گردن پر چڑھتے - مگر اس میں اتنی بھی طاقت نہ تھی کہ دُم ہلا کر ان کو بھگا دیتا - وہ خاموش لیٹا ہوا اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں پوری کر رہا تھا - مہترانی بھی اس جگہ کو صاف کرتے وقت ناک بھوں چڑھاتی، وہ کوستی کہ یہ کم بخت مر کیوں نہیں جاتا کہ پاپ کٹے - وہ لید اٹھانے سے پہلے ایک لات اس کی پیٹھ پر جڑ دیتی تھی - دوسرے گھوڑوں سے بچی ہوئی گھاس اسے کھانے کے لئے ملتی - اور وہ بھی بہت قلیل مقدار میں وہ اسے بھی نہ کھا سکتا - طویل بیماری سے اس کی بھوک پیاس بند ہو گئی تھی - اس کے لئے تمام دنیا ایک اصطبل میں محدود ہو کر رہ گئی تھی - ایک ہی حالت میں لیٹے لیٹے جب اعضا تھک جاتے، اور بدن میں شدید درد ہونے لگتا تو وہ کوشش کر کے زیادہ سے زیادہ کروٹ بدل لیتا، تاکہ عارضی طور پر کچھ سکون حاصل ہو جائے اور بس - قرب و جوار کے شریر بچے دور کھڑے ہو کر اسے پتھر اور مٹی کے ڈھیلے مارتے - بعض بے رحم لڑکے پچکاریوں میں سرد پانی بھر بھر کر اس کی طرف پھینکتے - جس سے اس کے زخموں میں مرچیں سی لگنے لگتیں - وہ درد بھری آواز سے ہنہناتا اور خاموش ہو جاتا - بچے خوش ہو کر تالیاں بجاتے اور ہنستے ہوئے چلے جاتے - اس کی بے بسی کی حالت پر کسی کو رحم نہ آتا تھا

موسم سرما کی ایک رات تھی نصف سے زیادہ حصہ گذر چکا تھا - اس کے زخموں کی تکلیف حد سے زیادہ بڑھ گئی - یہاں تک کہ اس کے دل میں تمام مصائب و آلام کے خلاف جہاد کرنے کا جذبہ پیدا ہوا اپنی تمام پس ماندہ قوتوں کو جمع کر کے اس نے ایک آخری کوشش کی اور کھڑے ہونے میں کامیاب ہو گیا - وہ کھڑا ہو گیا - مگر اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں - جسم کا ایک ایک حصہ بید کی طرح کانپ رہا تھا - اس کا بھاری جسم ان نحیف ٹانگوں کے لئے ایک بار گراں تھا - مگر پوری ہمت سے کام لے کر اس نے توازن کو قائم رکھا

سب سے پہلے اس کی نظر ناند پر پڑی جس میں کئی دن کی سوکھی ہوئی گھاس کا تھوڑا سا ڈھیر پڑا تھا - اس کے سینہ پر سانپ سا لوٹ گیا، جب اس نے خیال کیا کہ مالک اب اس کی خوراک کی بھی پروا نہیں کرتا - اس کے سامنے وہ منظر آ گیا - جب گھوڑ دوڑ کے میدان میں پہلی بار وہ اول نمبر آیا تھا - واپسی کے وقت ایک عروس نو کی طرح اس کی گردن پھولوں کے گجروں سے لدی ہوئی تھی - اس روز خود مالک نے اپنے ہاتھوں سے اس کی مالش کی تھی - اور کئی روز تک صبح و شام بالٹی بھر کر دودھ جلیبیاں اسے کھلائی گئی تھیں - اس نے تھوڑی دیر کے لئے خیال کیا کہ انسان بہت قدر ناشناس اور خود غرض ہے - وہ پھولوں سے لطف اندوز ہو لینے کے بعد انھیں مسل کر پھینک دیتا ہے - مگر جلدی ہی اس نے اپنی

رائے تبدیل کرلی - کہ شاید دنیا والوں کا یہی دستور ہو - کہ ہر چیز کو برت لینے کے بعد نظر سے گرا دیا جائے

پھر اس کی نگاہ لکڑی کے کھونٹے پر پڑی جس کے ساتھ کبھی آہنی زنجیروں کے ذریعہ اس کو باندھا جاتا تھا - مگر اب وہاں سن کی معمولی رسی بھی نہیں تھی - کیونکہ کسی شخص کو یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ گلفام میں چپکے سے بھاگ جانے کی ہمت ہے - اپنی اس بے بسی کی حالت پر اس کے آنسو نکل پڑے - اتنے ہی میں ایک چوہے نے بل سے سر نکال کر اپنے تیز دانت دکھائے - گویا وہ اسے کاٹ کھانے کی دھمکی دے رہا ہے - گلفام نے چاہا کہ سُم کی ایک ضرب سے اس چھوٹے سے جانور کی ہڈی پسلی ایک کردے - مگر فوراً رک گیا کہ مبادا اس کشمکش میں جسمانی توازن بگڑ جائے - اور دوبارہ اسی جگہ گر پڑے جہاں کئی دن سے بے یار و مددگار پڑا تھا - اس نے آخری بار اس چار دیواری پر حسرت کی نگاہ ڈالی - جس کے اندر زندگی کا بیشتر حصہ گذارا تھا - اور لرزتے ہوئے پاؤں کو جنبش دے کر چلنے لگا - اس کے دونوں کولھے نجاست میں لتھڑے ہوئے تھے اور جگہ جگہ جسم پر مٹی جم کر خشک ہو گئی تھی

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے

طویلہ سے نکل کر وہ سائیس کی کوٹھری کے قریب سے گذرا - جو دروازہ بند کئے دنیا و مافیہا سے بے خبر گہری نیند سو رہا تھا - وہ رک کر ہنہنایا گویا اپنے اَن داتا کو بھی آخری بار الوداع کہہ رہا ہے - اسے یقین تھا کہ اب میں زندہ واپس نہیں آؤں گا

اس نے آسمان کی طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھا - چاند اپنے پورے شباب پر تھا - ستارے جگمگا رہے تھے - موسم سرما میں چلنے والی ہوا کے جھونکے اعضا کو مفلوج کر دینے کی حد تک سرد تھے - اور اس کا جسم ٹھٹھر کر رہ جاتا - اگر زندہ رہنے کی آخری کشمکش کے جوش نے اس کے اندر حرارت نہ پیدا کر دی ہوتی - چاندنی رات میں اس سنسان مقام پر کھڑے ہو کر اس نے تصوّر کی آنکھ سے اپنے عہدِ شباب کو دیکھا - ایک دن وہ جوان تھا اور چست و چالاک - اس کی رگوں میں تازہ خون دوڑتا تھا - اس کے جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی - مگر سریع الزوال - چار ہی قدم چلنے سے اس کا سانس پھولنا شروع ہو گیا تھا - وہ باغیچہ میں سے گذرا - جہاں اس کے مالک نے مختلف الالوان پھولوں کے پودے لگا رکھے تھے - اس نے چاہا کہ اپنے سموں سے سب کو روند کر فنا کر دے - اور اس طرح اپنے جوشِ انتقام کو سرد کرلے "مگر مجھے کیا فائدہ؟" اس سوال کے پیدا ہوتے ہی اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا

باغیچہ کے ایک کونے میں مالی کی کٹیا تھی - وہ رک گیا - اور پھونس کی دیوار کے قریب اپنی آنکھ لگا کر ایک روزن سے جھانکا کہ بوڑھا بے خبر سو رہا ہے - اس نے ارادہ کیا کہ اسے بیدار کر کے کہے - کہ " اے پندرہ روپے کے ملازم! اب تو مجھے ہری ہری گھاس نہیں دیتا - میں مالک سے تیری شکایت کر دوں گا" مگر خود اسی کے قلب سے ایک درد بھری صدا نکلی - کہ " اے بے وقوف خود تیرا مالک تیری فکر نہیں کرتا - اسے تیری پروا نہیں - وہ تو چاہتا ہے کہ تو کل کا مرتا آج

ہی مرجائے۔ وہ تیری فریاد کو کن کانوں سے سنے گا؟"

چند قدم چلنے کے بعد باغیچہ کی حد ختم ہوگئی۔ خاردار تاروں کی باڑھ لگی ہوئی تھی۔ وہ رک گیا۔ تار زیادہ اونچے نہیں تھے۔ مشکل سے ڈیڑھ فٹ ہوں گے۔ کھیل کے میدان میں وہ چار چار فٹ بلند جنگلے آسانی سے چھلانگ مار جاتا تھا۔ مگر اب ٹانگوں میں سکت باقی نہیں تھی۔ چھلانگ مارنا تو درکنار راستہ چلنا بھی دوبھر تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر جسم کمزور کیوں ہوجاتا ہے؟ بدن کی طاقت کہاں چلی جاتی ہے؟۔ مگر یہ ایک مشکل مسئلہ تھا۔ جس کو سمجھنے سے اس کی عقل حیوانی قاصر تھی۔ اس نے مناسب نہ سمجھا کہ ایک ہی جگہ زیادہ دیر تک کھڑا رہے۔ اس خیال سے کہ کہیں جسم کی تھوڑی بہت گرمی زائل ہوکر سردی کا احساس پیدا نہ کردے۔ وہ پھر چل پڑا۔ حالانکہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی کمزور ٹانگیں اس کو کہاں لئے جارہی ہیں۔ کوئی مخصوص منزلِ مقصود اس کی نظر کے سامنے نہیں تھی۔ وہ کارواں سے الگ ہوکر بھٹکنے والے مسافر کی طرح تھا۔ جس کا ہر قدم لاعلمی کی حالت میں کبھی منزل کی طرف اُٹھ جاتا ہے اور کبھی منزل سے دُور

وہ جنگلے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا کہ شاید کہیں یہ سلسلہ ختم ہوجائے یا ایسا مقام آجائے جس کو عبور کرلینا اس کے امکان میں ہو۔ وہ چلا جارہا تھا۔ اور بے خبر تھا کہ کائناتِ عالم کا ہر ذرہ اس کے تاثراتِ قلب کا دقیق مطالعہ کرکے اس کے ساتھ ہم آہنگ ہوجانا چاہتا ہے۔ اس نے محسوس نہ کیا کہ ہر شے کا غیر مرئی دل جذباتِ ہمدردی سے مغلوب ہوکر اس کے لئے دھڑک رہا ہے

اتفاقاً ایک جگہ تار ٹوٹ جانے سے باڑھ میں ایسی جگہ بن گئی تھی جہاں سے گذر کر باغیچے سے باہر نکل جانا اس کے لئے آسان تھا۔ وہ خوش ہوا کہ اب آزادی کی فضا میں پہونچ کر سانس لوں گا۔ مگر عین اس وقت بنگلہ کی طرف سے کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ وہ سہم کر کھڑا ہوگیا۔ افشائے راز کے خوف سے اس کا تمام جسم لرزنے لگا۔ اس نے زمین کی طرف دیکھا۔ جس کی سطح پر پڑنے والا سایہ بھی کانپ رہا تھا۔ پھر اس کی نگاہ آسمان کی طرف اٹھی چاند پوری طرح روشنی پھیلا رہا تھا۔ اس نے آرزو کی کہ کاش آج کے دن یہ قندیل فلک گل ہوجاتی تو بہتر تھا۔ مگر کسی کی آرزو کے مطابق نوامیسِ فطرت میں تغیر نہیں ہوتا۔ اس کے قوانین اٹل ہیں۔ اسے یقین ہوگیا کہ کتے کی آواز سے تمام چوکیدار بیدار ہوجائیں گے۔ اور سمجھیں گے کہ کوئی چور بنگلہ کی حدود میں گھس آیا ہے۔ بے شک وہ بھی چور تھا۔ کم از کم اس کا دل چور تھا۔ اس نے اپنی ضمیر کی آواز صاف طور پر سنی۔ وہ چوروں کی طرح دبے پاؤں اپنے مالک کے گھر سے فرار ہورہا تھا۔ لازمی بات تھی کہ چاند کی روشنی میں چوکیدار اس کو باڑھ کے قریب کھڑا دیکھ لیں گے۔ اور پکڑ کر واپس لے جائیں گے۔ تیز دوڑ جانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اس نے گذشتہ واقعات پر غور کرکے سوچا کہ کیا دوبارہ اس مسموم فضا میں زندگی بسر کرنی پڑے گی۔ جہاں رہتے رہتے اس کی طبیعت اکتا چکی ہے ——— پھر وہی زندگی؟

جس سے مر جانا بہتر ہے

اس نے بنگلہ کی طرف دیکھا - کوئی چیز سایہ کی طرح حرکت کر رہی تھی - ایک چوکیدار بیدار ہو چکا تھا - اس نے اچھی طرح پہچان لیا - یکایک روشنی نمودار ہوئی - اور سب طرف چکر لگا کے اس کے جسم پر پڑنے لگی - اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے انتہائے یاس میں اس نے آنکھیں بند کر لیں - لیکن جب خلافِ توقع چند لمحے تک کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی تو اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں - روشنی مفقود ہو چکی تھی - اور صرف ایک کتا اس کے قریب کھڑا دم ہلا رہا تھا - وہ سمجھ گیا - کہ چوکیدار نے ارادتاً اس کی طرف سے لاپرواہی اختیار کر لی ہے - وہ چاہتا ہے - کہ یہ بلا کسی طرح دور ہو جائے - زخموں کی افراط کے باعث گلفام کی کھال بھی اس لائق نہیں تھی - کہ اس سے فائدہ حاصل کیا جائے - پھر اسے کون پکڑتا - اس خطرناک مستقبل سے بچ جانا ہی اس کے لئے باعثِ مسرت بن سکتا تھا - مگر اس امر کا احساس کہ اب اس کی ہستی کو ایک بیکار شے تصور کر کے نظر سے گرا دیا گیا ہے - اس کے لئے سوہانِ روح بن گیا - اب اس کی ٹانگوں میں کوئی تکلیف باقی نہیں رہی - اس کے زخموں کی جپک بند ہو گئی - اصطبل کی مسموم فضا کا خیال بھی اس کے ذہن سے زائل ہو گیا - مگر اس کی روح کو ایک ایسی اذیت پہونچنے لگی، جو دنیا کے تمام مصائب و آلام سے زیادہ شدید ہوتی ہے - اس کے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ کوئی آئے اور اس کو دوبارہ لے جا کر اسی گندی اور بدبودار فضا میں ہمیشہ کے لئے قید کر دے - یہ بہتر ہے - بہ نسبت اس کے کہ دنیا کی کوئی ہستی اس کو نظرِ حقارت سے دیکھے - وہ کھڑا دیکھتا رہا - کہ اب کوئی آتا ہے - اب کوئی آتا ہے - مگر نہیں - کسی کو آنا تھا - نہ آیا - اس کی امیدیں پامال ہو گئیں - فضا میں کسی کا سایہ حرکت پذیر نہ ہوا - وہ خود اپنی ٹانگوں سے چل کر واپس جانا نہیں چاہتا تھا - اس کی خودداری مانع تھی - ترک کے ہوئے راستہ پر خود اپنی ہی مرضی سے گامزن ہو کر ہار مان لینا اس کی شان کے خلاف تھا - اس کے پندار میں وہ ایک ایسا اعترافِ جرم تھا - جس کا عملی پہلو بذاتِ خود ایک زبردست جرم ہے - وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنی ہستی کو اور زیادہ گناہ آلودہ کرے - اسلئے بادلِ ناخواستہ وہ آگے بڑھ جانے کے لئے مڑا مگر عین اس وقت اس کی نگاہ کتے پر پڑی - حالانکہ وہ کافی دیر سے اس کے قریب کھڑا دم ہلا رہا تھا - وہ پھر ٹھٹھک گیا - اس نے پہچان لیا - وہ موتی تھا - وہ دونوں ایک دوسرے کے دوست رہ چکے تھے - اس وقت اس کا دماغ - جس کا توازن حوادثِ زندگی سے بگڑ چکا تھا - یہ سمجھنے سے قاصر تھا - کہ یہ دیرینہ دوست مصیبت کے وقت بھی کام آتا ہے یا نہیں - ایسی صورت میں کہ خود اس کے قوا اس کے احکام سے انحراف کرنے لگے تھے - یہ کس طرح توقع کی جا سکتی تھی کہ ایک غیر جنس ہستی اس کا ساتھ دے گی - اس نے سوچا - "کاش! میرا وجود ازلی تخلیق کی ساعتوں کا رہینِ منت نہ بنتا - میری ماں مجھ کو جننے سے قبل مر جاتی"

اس نے اپنی گردن جھکا کر تھوتھنی موتی کے قریب کی - گویا وہ اس کے کان میں کچھ کہنا چاہتا تھا - مگر نطق سے محروم ہونے کے باعث کچھ بول نہ سکا - اور اس مجبوری کے عالم میں اس کے تمام جذبات "معنیٔ بے لفظ" بن کر رہ گئے

موتی جھکا - اور گلفام کے سُموں کو چاٹنے لگا - اس بے زبان کے پاس بھی اظہارِ ہمدردی کے لئے اس سے زیادہ بہتر ذریعہ نہیں تھا - محبت بھرے دل کی سچی باتیں زبان سے ادا نہیں کی جا سکتیں - اور شرمندۂ الفاظ بنے بغیر حساس قلب کے کانوں سے سُن لینی ممکن ہیں - وہ ایک دوسرے کا مطلب سمجھ گئے - موتی نے راہبری کی اور مظلوم و بیکس گلفام اس کے ساتھ ہو گیا

صبح کی سپیدی نمودار ہونے سے قبل وہ بمشکل ایک فرلانگ گئے ہوں گے - کہ گلفام کے لئے آگے قدم اٹھانا دوبھر ہو گیا - اس کا سانس بہت تیزی سے چل رہا تھا - تمام جسم میں تھرتھری پیدا ہو گئی تھی - ٹانگوں پر کافی دیر زیادہ زور پڑنے کے باعث زخموں کے اندر سے خون برسنا شروع ہو گیا تھا - اور اس طرح اس کی رگوں میں سے نکلے ہوئے عزیز خون نے زمین پر ایسے نقوش پیدا کر دیے - کہ اگر کوئی تعاقب کرنا چاہے - تو آسانی سے سراغ ملتا چلا جائے - اس نے حسرت سے اپنی ٹانگوں کو دیکھا - ان ٹانگوں کو جن کی طاقت اس کو کھیل کے میدان میں کامیاب بنا دیتی تھی - مگر آج اس کے جسمِ زار کو بھی گھسیٹنے سے معذور تھیں - اپنی عظمتِ گذشتہ کا خیال کر کے وہ رونے لگا - اس کی کمر سینکڑوں زخموں سے داغدار تھی - اور جگہ جگہ نجاست لتھڑی ہوئی تھی - حالانکہ کچھ عرصہ قبل اس پرندے کس کر سواری لینا انسان کے لئے باعثِ فخر تھا

دو روز سے پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں پیا تھا - اس کے حلق میں کانٹے پڑنے لگے - کچھ نہ کھانے کی وجہ سے نقاہت بڑھ رہی تھی - زخموں کی تکلیف سے جسم نڈھال تھا زندہ رہنے کی تمنا میں مزید کشمکش کرنا اس کی طاقت سے باہر ہو گیا اس کی ٹانگیں لڑکھڑائیں - آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا - وہ گر پڑا - لڑکھڑا کر گر پڑا - زمین بالکل پتھریلی تھی - چھوٹے چھوٹے سنگریزے اس کے زخموں میں گھُس گئے - وہ تکلیف سے بلبلا اٹھا - مگر کوئی نہیں تھا جو ایک چمکاری دے کر اس کے درد میں کمی کرنے کی کوشش کرتا - اس نے دو چار لاتیں ماریں کہ شاید اس طرح بچاؤ کی کوئی صورت نکل آئے - مگر الٹا اثر ہوا - قریب کی خاردار جھاڑیاں اس کے زخموں پر نشتر زنی کرنے لگیں - آخر کار بے حال ہو کر وہ خاموش لیٹ گیا - اس کی گردن کی رگیں پھولنے لگیں - اور پسلیوں سے لگا ہوا پیٹ لوہار کی دھونکنی کی طرح زور زور چلنے لگا - اس کا سانس اکھڑ گیا - دونوں نتھنے خون آلود جھاگ سے بھر گئے - اس کا ہنہنانا بھی ایک بھیانک شور میں تبدیل ہو رہا تھا - اس کے کراہنے کی آواز سُن کر کس کے دل میں رحم پیدا ہوتا - جب کہ وہاں کوئی متنفس موجود نہیں تھا - اس کی تمام گریہ و زاری صدا بصحرا تھی - اس کی آہ و بکا کو صرف ان جنگلی طیور نے سنا جو قریب کے ایک پرانے درخت پر اپنے اپنے گھونسلوں میں چھپائے بیٹھے تھے - مگر اس کے آنے ہی سے قبل اس کی بے جا اور غیر متوقع مداخلت کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوئے اڑ چکے تھے - صرف اسی مرنے والے کی جانکنی کی آہیں خاموش فضا کے طلسمِ سکوت کو توڑ رہی تھیں - یا کبھی کبھی موتی کے بھونکنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی - جو انتہائی بے چینی کے ساتھ اپنے قریب المرگ رفیق کے جسمِ زار پر تھوتھنی رگڑ رگڑ کر اظہارِ ہمدردی کر رہا تھا

وہ بار بار اس کی ایال اپنے منہ میں پکڑ کر گھسیٹتا۔ اس کے سموں پر اپنے پنجے مارتا۔ مگر مرنے والا۔ گلفام نہیں سمجھ سکا کہ اس کا دوست اسے کہاں چلنے کے لئے آمادہ کر رہا ہے۔ اگر موتی میں سمجھ ہوتی اور اس کی پتلی ٹانگیں اس بارِ گراں کی حامل بننے کی اہل ہو سکتیں تو وہ یقیناً گلفام کو اپنی کمر پر لاد کر ایک ایسی فضا میں لے جاتا جہاں کوئی اس کے زخموں کو مندمل کر دیتا۔ وہ اس کو انسانوں کی دنیا سے نکال کر معصوم فرشتوں کی نگری میں پہونچا دیتا جس جگہ ہر دھڑکنے والے دل میں سچی اور بے لوث محبت کا دریا لہریں مارتا ہے۔ جس مقام پر سانس لینے والا ہر متنفس پژمردہ پھولوں کی بھی اتنی ہی قدر کرتا جتنی ان کی حالتِ شگفتگی میں۔۔۔

سورج کافی طلوع ہو چکا تھا۔ کسان جھونپڑوں سے نکل کر کھیتوں کی طرف جانے شروع ہو گئے۔۔۔ مویشیوں کی گردنوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی صدا سنائی دینے لگی۔ کسی دور کے کھیت سے درانتی کی آواز بھی سنائی دی۔ شاید چنے کی فصل تیار ہو گئی تھی۔ گلفام زمین پر سم رگڑنے لگا۔ اس نے زور سے لاتیں چلائیں۔ ہنہنانے کی ناکام کوشش کی۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی دیہاتی کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلے۔ یہ لوگ بہت نیک اور ہمدرد ہوتے ہیں۔ مگر اس کی فریاد کسی کے کان تک نہ پہونچی۔ موتی بھی اپنے دوست کا منشاء سمجھ کر چلانے لگا۔ وہ اتنی زور سے بھونکا، کہ قرب و جوار کے دوسرے کتے بھی اس کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئے۔ کتوں کی فطرت ہے کہ اپنے ہم جنس کی آواز سن کر خواہ مخواہ چلانے لگتے ہیں۔ گویا انھیں بھی اس کے ساتھ ہمدردی ہے۔ مگر کتوں کی زبان کو بھی کسان نہ سمجھ سکے۔ کھیت پک چکے تھے اس لئے وہ اپنے کام میں پورے انہماک کے ساتھ غرق تھے

گلفام اپنے خیالات میں محو ہو گیا۔ ایک خوابِ بیداری کے عالم میں کوٹھی کا منظر اس کی نگاہ کے سامنے تھا۔ تخیل کی آنکھ سے اس نے دیکھا کہ مالک اور گھر کے دوسرے لوگ بیدار ہو گئے ہیں۔ ملازم اپنے فرائض کی انجام دہی میں کمربستہ ہیں سائیس سے گلفام کی حالت دریافت کی جا رہی ہے۔ وہ اطلاع دیتا ہے کہ رات کے سکوت میں وہ کہیں بھاگ گیا۔ مالک " خس کم جہاں پاک " کہہ کر قہقہہ لگاتا ہے۔ اور سائیس کو ہدایت کرتا ہے کہ بہت جلد مہترانی کو بلا کر اصطبل صاف کرائے اور اس میں گندھک روشن کردے۔ سفیدی کرانے کا بھی حکم دیا جاتا ہے۔ گلفام چونک پڑا۔ اس کے زخمی سینہ سے ایک آہِ سرد نکلی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے آسمان کی طرف آنکھیں اٹھائیں اور بادل کی چادروں میں موت کے فرشتوں کو تلاش کرنے لگا۔ وہ زندگی سے تنگ آگیا تھا۔ اسے مرجانے کی آرزو تھی

موتی بھاگ کر قریب کے ٹیلے پر چڑھ گیا۔ اور وہاں کھڑے ہو کر خوب چلایا۔ مگر بے سود۔ اس بستی کے تمام لوگ کم از کم اس دن کے لئے بہرے ہو گئے تھے۔ اس کی فریاد کو نہ سن سکے۔ وہ جلدی ہی واپس آگیا۔ اس خیال سے کہ تنہائی ناخوشگوار لمحات میں مرنے والے دوست کو کوئی غیر معمولی صدمہ نہ پہونچ جائے۔ اس نے دیکھا کہ گلفام کے منہ پر مکھیاں بھنکنے لگی تھیں۔ اس کی زبان جبڑے کے باہر لٹک رہی تھی۔ آنکھیں کھلی ہوئی مگر بے نور تھیں مکھیاں زخموں پر بیٹھتیں تو

بدن میں تھرتھری پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اب اس کا جسم بے حس ہو چکا تھا

اس کی روح کبھی کی نکل چکی تھی۔ مگر موتی کو یقین نہ آیا۔ کہ گلگام مر گیا ہے۔ وہ سمجھا کہ انتہائی کمزوری کے باعث غنودگی طاری ہو گئی ہے۔ اس لئے وہ خود بھی خاموش ہو کر زمین پر پنجے ٹکا کر بیٹھ گیا۔ اور ایک فلسفی کی طرح زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگا

کائنات عالم کی تخلیق سے خدا کا منشائے حقیقی کیا ہے؟ انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ کس وجہ سے دیا گیا؟ دیگر حیوانات نطق سے کیوں محروم رکھے گئے؟ مسرت و انبساط کے ساتھ مصائب و آلام کو وابستہ کر کے زندگی کو تباہ کر دینا کس مصلحت کی بنا پر ہے؟ ایسی ہستیوں کو موت جلد کیوں نہیں آجاتی جو خود اپنی زندگی سے بیزار ہوں؟

یہ تھے وہ سوالات جو یکے بعد دیگرے موتی کے دل میں پیدا ہوئے مگر اس کی عقل نارسا کسی ایک رمز کی بھی عقدہ کشائی نہ کر سکی۔ حتیٰ کہ آفتاب غروب ہونے کے قریب ہو گیا۔ اور گلگام کو ہوش نہ آیا۔ کیونکہ وہ ابدی نیند سو رہا تھا ــــ

طاہرہ دیوی (شیرازی)

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

جس میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور ان کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اور آئندہ اخلاق انسانی کی بنیاد کن اصول پر قائم ہوتا ہے۔ الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایک بار شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز واقعات درج ہیں کہ آپ نے کبھی سنے نہ ہوں گے

اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول ۸ر کے مجلد کتاب صرف ۱۲؍ میں اور غیر مجلد ۸؍ میں ملے گی اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد ۱۲؍ میں اور غیر مجلد ۸؍ میں علاوہ محصول ۸ر کے ملے گی

اگر

ارشاد ہو تو کتاب ذریعۂ وی۔پی روانہ کی جائے حجم ۲۷۵ صفحات آرڈر میں مجلد و غیر مجلد کی صراحت ضروری ہے

منیجر نگار لکھنؤ

غرائب فلکی اور کائنات کی عظمت

ہم کرۂ ارض کے باشندے جب کسی مسافت کو ناپنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے انچ، گز، میل وغیرہ سے کام لیتے ہیں، مثلاً زمین کے قطر کی ناپ ۸ ہزار میل بتاتے ہیں، اُس کا محیط ۲۵ ہزار میل ظاہر کرتے ہیں۔ اور سورج کا فاصلہ زمین سے ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل کہتے ہیں، لیکن اگر جسم یا مسافت بہت زیادہ گھٹ بڑھ جاتی ہے تو اس کے لئے موجودہ ناپ تول کے آلات بالکل ناکافی ثابت ہوتے ہیں

مثلاً اگر ہم چاہیں کہ روشنی کی ایک موج کو ناپیں تو اس کے لئے سنٹیمیٹر کی ناپ بھی بہت بڑی ہے کیونکہ یہ موج اتنی چھوٹی ہے کہ اس کا خیال بھی دشوار ہے۔ چنانچہ اس کی ناپ کے لئے علماء نے ایک اصطلاح میکرون کی ایجاد کی جو ملی میٹر کا ہزارواں حصہ ہے

اس کے بعد جب سوال پیدا ہوا۔ اکس شعاعوں کا تو میکرون بھی بڑا مقیاس ثابت ہوا اور اس کے لئے انگسٹرم کی اصطلاح وضع کی گئی جس کے معنے ہیں ایک انچ کا ایک اربواں حصہ، اور ہندسوں میں اس طرح ظاہر کر سکتے ہیں $\frac{۱}{۱۰۰۰۰۰۰۰۰۰}$ انچ — یہ تو حال ہوا چھوٹے چھوٹے اجسام کی پیمائش کا۔ لیکن اب دور کی مسافتوں کو لیجئے، کہ اگر وہ بہت زیادہ بڑھ جائے تو میل وغیرہ سب بیکار ہو جاتے ہیں۔ مثلاً آپ ایک ستارہ الفاقنطوروس کو لیجئے جو ہمارے نظام شمسی سے قریب ترین واقع ہونے والا ستارہ ہے لیکن اس کا بعد زمین سے، آفتاب اور زمین کے بعد کا تین لاکھ گنا ہے یعنی اگر ہندسوں میں اسے ظاہر کریں تو ۲۳ کھرب میل ہوں گے۔ اسی لئے علم ہیئت میں ان فاصلوں کے ناپنے کے لئے روشنی کی رفتار کو مقیاس قرار دیا ہے۔ یعنی جب ایک ستارہ کا فاصلہ دوسرے ستارہ سے ظاہر کرنا ہوتا ہے تو یوں کہتے ہیں کہ یہاں سے وہاں تک روشنی اتنی دیر میں پہنچتی ہے، چنانچہ ابھی جس ستارہ (الفاقنطوروس) کا ذکر کیا ہے اُس کا بعد زمین سے ساڑھے تین سال نوری ہے،

ے ملی میٹر، میٹر کا ہزارواں حصہ ہے اور میٹر ساڑھے تین فٹ سے کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے میکرون برابر ہوا ۰۰۰۰۳۹۳۷۰۷۹ء. انچ کے

یعنی وہاں کی روشنی[۱] زمین تک ساڑھے تین سال میں پہونچتی ہے، اسی طرح ایک اور ستارہ (شعریٰ) ہے جو زمین سے دس نوری سال کے فاصلہ پر واقع ہے، قطب تارہ ۲۰۰ نوری سال کے فاصلہ پر ہے اور سدیم الجبار ۵۰۰ نوری سال کے فاصلہ پر۔

اگر ہم آفتاب کو مرکز قرار دیکر اس کے گرد ایک دائرہ کھینچیں جس کا قطر ہزار نوری سال کا ہو تو اس دائرہ میں وہ تمام ستارے آجائیں گے جو ہمیں آنکھ سے نظر آتے ہیں، لیکن اگر ہم اس دائرہ کو اتنی دُور پر کھینچیں کہ اس کا قطر ۲۵ ہزار نوری سال ہو تو اس میں وہ تمام ستارے آجائیں جو ہمارے نظام کہکشاں میں شامل ہیں، لیکن کیا اس طرح ہم فضا کے تمام ستاروں کا احاطہ کر سکیں گے۔ ہرگز نہیں، کیونکہ ہمارے نظام کہکشاں کے علاوہ خدا جانے اور کتنے کہکشانی نظام پائے جاتے ہیں جن کا بُعد ایک دوسرے سے لاکھوں نوری سال کا ہے اور جن میں سے ہر ایک نظام فضا کے سمندر میں بجائے خود ایک جزیرہ کی طرح قائم ہے

اگر ان تمام فضائی جزیروں کا بُعد ایک دوسرے سے ظاہر کیا جائے تو اس کے لئے نوری سال کا مقیاس بھی ناکافی ثابت ہوتا ہے، چنانچہ علماء نے اس کے لئے ایک اور مقیاس قائم کیا جس کی اکائی اوّل اوّل ایک ہزار نوری سال مقرر کی گئی تھی لیکن اب وہ ۱۰ لاکھ نوری سال تک پہونچ گئی ہے چنانچہ ستاروں کا وہ مجموعہ جس کا علمی نام .C .G .M ہے سات لاکھ نوری سال کے فاصلہ پر واقع ہے اور بعض سدیم[۲] ۱۰ لاکھ نوری سال کے بُعد پر ہیں "مراۃ المسلسلۃ" سدیم کے متعلق ہیئت دانوں نے تحقیق کی ہے کہ اس کے قطر کی لمبائی ۵ ہزار نوری سال کی ہے اور اس کے اندر کروروں ستارے ہیں جن میں سے اکثر علیحدہ نظر نہیں آسکتے ہیں اور جو نظر آتے ہیں وہ نور روشنی میں ہمارے سورج سے ہزاروں گنا زاید ہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر ہم اپنے سورج کو ۱۰ لاکھ نوری سال کے فاصلہ پر اٹھا کر رکھ دیں تو ہم اس کی عکسی تصویر نہیں لے سکتے، لیکن ان ستاروں کی تصویر باوجود اس قدر بُعد کے لی جا سکتی ہے

اسی سدیم میں جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے ۱۸۸۵ء میں اوّل اوّل بعض ایسے ستارے دریافت ہوئے۔ جو ہمارے آفتاب سے سو لاکھ گنا زیادہ روشن ہیں اور جس سے ہر سکنڈ میں کھرب اندر کھرب ٹن مادہ ہر وقت خارج ہوتا رہتا ہے۔ اور یہ حساب جدید مذہب اضافیتہ کے قواعد کی رُو سے لگایا گیا ہے

الغرض عالم میں بہت سی کائنات ہیں جن کا حال ہمیں اس وقت تک بہت کم معلوم ہو سکا ہے۔ پروفیسر لیوک

---

[۱] روشنی کی رفتار ۱۸۶۱۷۳ میل فی سکنڈ ہے

[۲] سدیم ترجمہ ہے (Nebula) یعنی کسی کرہ کا بالکل ابتدائی دخانی حالت میں پایا جانا

نے رصدگاہِ ولسن میں بیٹھ کر جو تحقیق کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ " مراۃ المسلسلۃ " کا سدیم ۲۰۰ میل فی سکنڈ کے رفتار سے ہماری طرف بڑھتا آرہا ہے۔ اور مجلان کا سدیم ۱۷۰ میل فی سکنڈ کے حساب سے دور ہوتا جارہا ہے، بعض سدیم اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ دور ہوتے جارہے ہیں، چنانچہ سدیم سوٰلبی ۱۱۰۰ میل فی سکنڈ کے حساب سے دور ہو رہا ہے۔ اور وہ کہکشاں جس میں ہمارا نظام شمسی داخل ہے۔ ان چکردار سدیموں کے درمیان ۲۰ ۵ میل فی سکنڈ کے حساب سے حرکت کر رہی ہے

فضا میں علاوہ چکردار سدیموں کے اور بہت سے سدیم ایسے ہیں جنھوں نے کوئی شکل خاص اختیار نہیں کی ہے یا زیادہ سے زیادہ یوں کہنا چاہئے کہ بُعد کی وجہ سے دُور بین سے ان کی شکل سمجھ میں نہیں آئی، گویا بے شمار کائنات ہیں جو طیار ہو رہی ہیں اور " دورِ تکوُّن " میں پائی جاتی ہیں

فضا کی وسعت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے اگر ہمارے نظام کہکشانی کو جس میں ۵۰ ہزار ملین ستارے پائے جاتے ہیں تباہ کر دیا جائے تو فضا میں اتنا خلا بھی محسوس نہ کیا جائے جتنا دریا میں ایک قطرہ کے نکال لینے سے محسوس ہوسکتا ہے

ہمارا نظام کہکشانی جس کا قطر ۵۰ ہزار نوری سال کا ہے، یوں سمجھ لو کہ فضا کی وسعت کے مقابلہ میں مسور کی دال کے برابر ہے جس کے علاوہ خدا جانے اور کتنی کائنات فضا میں پائی جاتی ہیں، اس وقت تک ہمیں علاوہ اپنے نظام کہکشانی کے مجلان کے کائنات کا علم ہوا ہے جو ۲ لاکھ نوری سال کے فاصلہ پر واقع ہے اور ایک کائنات کا تھوڑا سا حال معلوم ہوا ہے۔ جو ۷ لاکھ نوری سال کے بُعد پر پائی جاتی ہے۔ اسی طرح کچھ اور سدیموں کا حال معلوم ہو سکا جو دس دس لاکھ نوری سال دُور واقع ہوئے ہیں، لیکن فضا کی وسعت اور زمان و مکان کی لانہایت کا یہ عالم ہے کہ یہ جو کچھ ہمیں معلوم ہوا ہے وہ صرف اتنا ہے جیسے ریگزار صحرا میں سے دو چار ریگ کے ذرّوں کا حال معلوم ہو جائے۔

زمین ایک کرہ ہے جو فضا میں معلق ہے اور اس کی دو گردشیں ہیں، ایک خود اپنے محور پر اور دوسری آفتاب کے گرد، اپنے محور کے گرد ۲۴ گھنٹے میں اس کی گردش پوری ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح رات اور دن پیدا ہوتے ہیں، سورج کے گرد تقریباً ۳۶۵ ¼ دن میں اس کی گردش پوری ہوتی ہے اور اس سے سال وفصل کا

لہ یعنی چکردار سدیم - جب مادہ دخانی کیفیت میں آکر گردش کھاتا ہے تو بعض مرتبہ اس کی صورت کمانی کی طرح ہو جاتی ہے اور اسی کو سوٰلبی سدیم یا چکردار سدیم کہتے ہیں

حساب ہوتا ہے،

کرۂ ارض کا محیط ۲۴ ہزار میل کا ہے یعنی اگر ہم ۸۰۰ میل روزانہ کے حساب سے سفر کریں تو پورے ایک مہینے میں اس کے چاروں طرف گھوم سکتے ہیں، لیکن سورج کو دیکھتے ہوئے ہماری زمین کی کوئی حقیقت نہیں ہے، کیونکہ سورج کا قطر ۸۶۶۰۰۰ میل ہے یعنی زمین سے وہ ۱۳۳۱۰۰۰ گنا زیادہ بڑا ہے، لیکن اس کا مادہ بہت لطیف ہے اس لئے اس کی دبازت بہ نسبت زمین کے ۳۳۳۴۳۰ گنا زیادہ ہے، یعنی اگر اس کے مادہ کو کثیف کر کے کرُے طیار کئے جائیں تو ۳۳۳۴۳۰ کرۂ ارض بن سکتے ہیں

اس سے ظاہر ہے کہ آفتاب کتنا عظیم الشان کرہ ہے اور اس کی عظمت کے خیال سے واقعی عقل حیران رہ جاتی ہے، لیکن کائنات کی وسعت کے لحاظ سے آفتاب بھی نہایت حقیر کرہ ہے اور دور کروں کو دیکھتے ہوئے اس کی بھی وہی حیثیت ہے جو زمین کی اس کے مقابلہ میں ہے

وہ تارے جو خالی آنکھ سے ہم کو نظر آتے ہیں ۶۰۰۰ ہیں، لیکن دُوربینوں کے ذریعہ سے جو عکسی تصویریں لی گئی ہیں اُن سے ۲۲۴۰۰۰۰۰ تارے اور دریافت ہوئے ہیں، لیکن یہ شمار ہماری فضا کے تاروں کا نہیں ہے بلکہ صرف اس کہکشاں کے تاروں کا ہے جس کے نظام سے ہمارا نظام شمسی بھی وابستہ ہے

رات کو آسمان پر جو کہکشاں نظر آتی ہے اُسی سے ہمارا نظام شمسی متعلق ہے اور اُسی کے تاروں کی اتنی تعداد بتائی جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ رات کو تاروں کی کثرت سے مسلسل روشن سڑک سی نظر آتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تارے نہایت بیچ بیچ واقع ہوئے ہیں لیکن وہ ایک دوسرے سے بہت دُور واقع ہوئے ہیں اور اس دُوری کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ اگر آپ یورپ، ایشیا اور افریقہ میں ہر جگہ دس دس مکھیاں لے کر اُڑا دیں تو جو نسبت دُوری کی ان کے درمیان ہوگی وہی ان تاروں کے درمیان ہے

یہ حال ہے صرف ہماری کہکشاں کی وسعت کا۔ رہ گئیں اور کہکشائیں جن کا کوئی شمار نہیں اور وہ لاتعداد کرُے جو دخانی و گیسی حالت میں پائے جاتے ہیں، سو اُن کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے جبکہ ان کی روشنی لاکھوں سال کے بعد ہم تک پہونچتی ہے

صرف ایک ڈاکٹر ہبل نے جو عکسی تصویریں۔ دُوربین کے ذریعہ سے لی ہیں اُن سے ۲۰ لاکھ دخانی کرُوں کے وجود کا پتہ چلتا ہے جن کی روشنی ۱۴۰۰۰۰۰۰ سال میں ہم تک پہونچتی ہے۔ اور یہ کرُے ایک دوسرے سے اتنی دور واقع ہوئے ہیں کہ ایک کی روشنی دوسرے تک ۱۸۰۰۰۰۰ سال میں پہونچتی ہے، اور ان کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ ہر ایک کرہ سے ۲۰ لاکھ سورج ہمارے سورج کی طرح بن سکتے ہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ ڈاکٹر ہبل نے جو یہ ۲۰ لاکھ دُخانی کرُے اس عظمت و شان کے دریافت کئے ہیں وہ صرف ایک جھنڈ سے متعلق

ہیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ اس طرح کے کتنے جھنڈ فضا میں پائے جاتے ہیں، اور ان کے درمیان باہم کتنے کروڑ نوری سال کا فصل پایا جاتا ہے

پھر کائنات کا یہ تمام نظام خواہ خدا کا قائم کیا ہوا ہو یا از خود قایم ہو گیا ہو، اس بات کا ضرور ہم کو یقین دلاتا ہے کہ اس وسیع فضا میں ہمارا کرۂ ارض نہایت ہی حقیر کرہ ہے اور انسان جو اپنے آپ کو اتنا اہم سمجھتا ہے وہ خس و خاشاک سے بھی کم حیثیت رکھتا ہے، اس لئے کیا کوئی شخص اس کا یقین کرسکتا ہے کہ جس خدا نے اتنی وسیع فضا پیدا کر کے اسیں لاتعداد و بے شمار نظام کہکشانی طیار کئے ہوں وہ حقیر و ذلیل انسان کے فنا کرنے کے بعد اس سے محاسبۂ اعمال کرے گا، اس کو دوزخ میں ڈالے گا اور اُس سے اپنی برہمی کا اظہار کرے گا

میں نہیں سمجھتا کہ اس عقیدہ سے زیادہ کوئی اور توہین خدا کی ہوسکتی ہے

مجموعۂ استفسار و جواب

کی کتابت ہونے کے بعد یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس کی ضخامت کم از کم ڈیڑھ ہزار صفحات تک پہونچ جائے گی۔ اور یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ایک ہی جلد میں اسے شایع کیا جائے

اس لئے تین جلدوں میں اس کو پورا کیا جائے گا۔ اور ہر جلد کی قیمت چار روپیہ ہوگی۔ پہلی جلد اس سال کے آخر تک شایع ہوجائے گی اور باقی دو جلدیں سال آیندہ میں شایع ہوسکیں گی۔ اب براہِ کرم کوئی صاحب پیہ کا منی آرڈر بھیج کر اس کے حاصل کرنے کی کوشش نہ فرمائیں۔ اس وقت تک جن حضرات کی رقم وصول ہوگئی ہے ان کو پہلی جلد بعد اشاعت بھیجدی جائے گی۔ تینوں جلدیں اپنی اپنی جگہ بالکل مکمل چیز ہوں گی

پہلی جلد مکمل ہونے کے بعد اس کی فہرست نگار میں شائع کردی جائے گی تاکہ ناظرین کو اندازہ ہوجائے کہ اس میں کون کون سے مباحث آگئے ہیں

جو حضرات ابھی سے صرف خط بھیجکر اپنا نام درج کرالیں گے اُنکے ساتھ محصول ڈاک کی رعایت ضرور کی جائے گی

مینجر نگار لکھنؤ

ایک خط

جو مکتوب الیہ تک کبھی نہ پہونچ سکا

اتنا قاتل خط اور اسقدر طویل ! تمھارا مقصود صرف یہ کہنا تھا کہ آیندہ میں تمھیں کوئی خط نہ لکھوں، پھر یہ پورے چھ صفحے کیوں ؟ شاید اس لئے کہ دفعۃً ایسا کہتے تم کو حجاب آتا تھا ؟ یا یہ کہ جو کچھ تم اپنی تمام عمر میں مجھ سے رفتہ رفتہ کہتیں وہ سب ایک ہی بار کہہ دینا چاہا —— نہیں یہ کچھ نہیں —— میں سمجھتا ہوں کہ تم نے مجھے نہایت آہستہ آہستہ ذبح کرنا پسند کیا یعنی اس طرح کہ حلق پر چھری بھی چل رہی ہے، تم مسکرا مسکرا کر باتیں بھی کرتی جارہی ہو اور میں تمھاری شیریں گفتگو میں محو ہوں کہ دفعۃً ہاتھ شہ رگ کے پاس پہونچ جاتا ہے، یعنی تمھارا خط ختم ہوجاتا ہے اور اس حکم کے ساتھ کہ آیندہ تمھیں کوئی تحریر نہ بھیجوں —— بظاہر میں نے ایسا محسوس کیا جیسے کوئی نہایت قیمتی چینی کی قاب دفعۃً ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرجائے اور تھوڑی دیر کے لئے دل و دماغ دونوں معطل سے نظر آنے لگیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ خط لکھنے سے باز رکھ کر تم نے عمر میں پہلی مرتبہ مجھے اس کا موقعہ دیا کہ جو کچھ کہنا ہے آزادی سے کہہ لوں اور اپنے دل کی ہر وہ بات جو اس وقت تک تم پر ظاہر نہ کرسکا تھا، کہہ ڈالوں، کیونکہ اب مجھے کیا ڈر ہے، تم سُن نہ سکوگی اور دنیا سنتی ہے تو سنے —— اچھا تو شروع سے کیوں نہ چلوں —— ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمھارا خدا بادشاہ ...... !

تمھاری سب سے پہلی تحریر جب میرے ہاتھوں تک پہونچی تو میں نے سوچا کہ اگر تحریر کے یہی الفاظ میں تمھاری زبان سے سنتا تو کتنا اچھا ہوتا، یعنی اگر تم میرے سامنے بے حجابانہ آکر باتیں کرتیں تو کس قدر لطف آتا —— تمھیں خبر نہیں لیکن یہ سب کچھ ہوکر رہا —— میں نے تمھاری تحریر کے ایک ایک لفظ کو سمجھ کر حرفوں کی ایک ایک جنبش کو دیکھ کر کاغذ کے رنگ اور اس کی عطریت سے مدد لے کر میں نے تمھاری ایک تصویر کھینچی، کاغذ پر نہیں، قلب پر، دماغ کے اس پردہ پر جو صرف نغمہ و خوشبو کے نقش کے لئے مخصوص ہے اور میں اس سے کھیلنے لگا —— لو کیا

میں بتا ہی دوں کہ اُس تصویر کے خط و خال کیا تھے، یعنی تم کو میں نے تمھاری تحریر کے اندر کیونکر چھپا ہوا پایا ——— معاف کرنا ممکن ہے کوئی بات حقیقت کے خلاف یا تمھارے ذوق کے منافی ہو ——— لیکن جب یہ تحریر تم تک پہونچ ہی نہیں سکتی تو پھر یہ خیال کیوں ——— اچھا تو سنو، ایسا ہو یا نہو، دنیا پسند کرے یا نہ کرے لیکن مجھے تو اسقدر عزیز ہے کہ اگر تم واقعی ایسی نہ نکلیں تو مجھے افسوس ہوگا ——— معلوم نہیں کیوں لیکن تمھاری تحریر سے یہ یقین مجھے ضرور ہو گیا کہ تمھارا رنگ ذرا سا سانولا ہے، کھلتا ہوا سانولا۔ یعنی وہ رنگ جو کیفیات سے شروع ہوتا ہے۔ اور کیفیات ہی پر ختم ——— جو بہ نسبت باصرہ کے لامسہ اور ذائقہ سے زیادہ تعلق رکھتا ہے۔ اور جس کو دیکھ کر بے اختیار انگلیوں میں اضطراب اور ہونٹوں میں ارتعاش سا محسوس ہونے لگتا ہے ——— معاف کرنا۔ میرے ہاتھوں نے بھی تم کو چھُوا، میرے ہونٹوں نے بھی تمھارے اُن ملیح ہونٹوں کو مس کیا جو ریشم کی طرح نرم اور پنکھڑی کی طرح نازک تھے

ہر چند صحت کے لحاظ سے میں نے تم کو نحیف و کمزور پایا، لیکن جسم کا چھریرا پن، اعضا کا لوچ دل میں سمایا جا رہا تھا، اور تناسب اعضا سے زیادہ قامت کی رعنائی قیامت ڈھا رہی تھی

تمھارے بال بہت سیاہ تو نہیں ہیں لیکن ان میں خاص قسم کی چمک ضرور پائی جاتی ہے، اور تھوڑا سا گھونگھر کنپٹی کے پاس سے شروع ہوتا ہے ——— پیشانی بہت فراخ ہے اور اس میں ایک نیلگوں رگ اُبھری ہوئی مانگ تک پہونچ گئی ہے۔ بھویں جو کانی جوڑی ہیں ایک نہایت ہلکے خط کے ساتھ ایک دوسری سے ملی ہوئی ہیں

رنگ کے بعد سب سے زیادہ تابناک چیز تمھاری آنکھیں ہیں، جو ہر وقت کسی خیال میں مستغرق رہتی ہیں اور جن کو ایک بار دیکھ لینا گویا کسی نہایت عمیق چشمہ کے اندر ڈوبتے چلے جانا ہے

چہرہ کتابی تو نہیں ہے لیکن ٹھوڑی کی ساخت نے اس میں یہ کیفیت پیدا کر دی ہے، گردن اور اعضا کا تناسب یکساں طور پر نمایاں ہے۔ اور رفتار جس سے غیر معمولی سنجیدگی ظاہر ہوتی ہے، ساری کے اندر جسم کے اُس لوچ کو پوری طرح ظاہر ہونے نہیں دیتی، جو اگر تموج کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے تو تم ایک خوبصورت ناگن کی طرح سامنے سے راستہ کاٹتی ہوئی گزر جاؤ ——— عمر کی نسبت تم خود ظاہر کر چکی تھیں کہ وہ ۲۰ سے کم اور پندرہ سے زیادہ ہے ——— الغرض یہ تھی تمھاری تصویر جو میں نے تمھاری اوّلین تحریر کو دیکھ کر اپنے قلب پر مرتسم کی تھی، لیکن تمھاری بلند فطرت اور غیر معمولی ذہانت تو تمام قیاسات سے بلند ایک ایسی زبردست حقیقت تھی جس کو اگر میں شروع ہی سے نظر انداز نہ کر دیتا تو شاید اس سے قبل ہی تم کو یہ لکھ دینا پڑتا کہ " آئندہ میرے نام کوئی خط نہ بھیجا جائے "

- میں چاہتا تھا کہ تم مجھ سے اور زیادہ بے تکلف ہو جاؤ، اور میں تم کو کسی ایسے لفظ سے مخاطب کر سکوں جو تمھاری پیشانی پر ہلکا سا خم پیدا کر سکے، لیکن اچھا ہوا کہ اس منزل تک پہونچنے سے قبل ہی، یہ بساط اُلٹ

دی گئی، اور تم نے اپنی زندگی کی اس تلخ حقیقت کو سمجھ لیا۔ کہ اگر عورت اس کے سمجھنے پر مجبور نہ ہو تو خدائی کا دعوی بھی اس کے لئے کوئی بڑی چیز نہیں

ہر چند میں تم کو دنیا میں آزاد، انسانی دسترس سے دُور کسی آسمانی دیوی کی طرح بلند دیکھنا چاہتا تھا، لیکن میری یہ تمنا پوری نہ ہوئی۔ اور تمہاری زندگی کا وہ دَور جب تمہارا جسم تمہاری روح کے اندر محوِ خواب تھا، بہت جلد ختم ہو گیا

پھر بتاؤ کہ اب تمہاری رومان آفرینیوں کا کیا عالم ہے، تمہاری محبت کی وہ اثیری فضا کیا ہو گئی جہاں عرد کی پروازِ خیال کو بھی تم تھکا کر گرا دینا چاہتی تھیں — مگر میں یہ کیوں پوچھ رہا ہوں، مجھے کیا حق حاصل ہے اور اگر تم جواب بھی دو تو مجھ سے کہنے کے لئے الفاظ کہاں سے لاؤ گی، اور کہو گی بھی تو کلیجہ پر ہاتھ کون رکھے گا،

تمہارے اس چھ صفحے کے خط میں، سب سے زیادہ تڑپا دینے والی خبر اگر کوئی تھی تو صرف یہی کہ تمہارے جسم کے ساتھ تمہاری روح کا سودا ابھی نہیں ہوا، مجھے اس خبر سے خوش ہونا چاہیے تھا، لیکن باور کرو کہ میں یہ سنکر بہت ملول ہوا اور دیر تک سوچتا رہا کہ تم کتنی گھبراتی ہو گی — میں تو اب تسکین کے الفاظ بھی تم تک نہیں پہونچا سکتا، کیا کروں مجبور ہوں، اچھا تو اب میں اپنی تسکین کی چیزیں بھی اپنے سے جدا کئے دیتا ہوں اور تمہارے وہ تمام خطوط جن کو میں نے اس وقت تک حرزِ جاں بنا کر رکھا تھا۔ نذرِ آتش کرتا ہوں

اے عزت و شرافت کی دیوی! میری یہ قربانی قبول کر لے

اولی الالباب سے خطاب

جناب مولوی سعید الدین صاحب ام۔ اے۔ ایل۔ ایل بی سب جج بریلی کا وہ مشہور رسالہ جو کئی سال قبل شایع ہو کر ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ اسمیں صاحب موصوف نے قرآن کی اہمیت اور اسکو سمجھ کر پڑھنے پر نہایت دلکش انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اس کا مطالعہ خواتین کے لئے از بس ضروری ہے۔ ۵/ کے ٹکٹ بھیجکر حاصل کیجئے

منیجر نگار لکھنؤ

علاج باالغسل

(تاریخ)

یہاں لکھنؤ میں ایک صاحب نربدا پرشاد صاحب سریواستوا ہیں، جن سے بالکل اتفاقیہ ملاقات ہو گئی۔ چونکہ مجھے بھی اس علاج کا کئی بار مفید تجربہ ہو چکا ہے اس لئے مجھے موصوف کی گفتگو سے بہت دلچسپی پیدا ہوئی اور میں نے انھیں آمادہ کیا کہ اُردو میں اپنے تجربات کو قلمبند کر دیں۔ چنانچہ میں شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری خواہش پوری کی اور اس طرح اس مضمون کا پہلا حصہ اس ماہ کی اشاعت میں درج کیا جاتا ہے،

مسٹر نربدا پرشاد کے مسودات دیکھ کر مجھے حیرت ہو گئی کہ انھوں نے کس محنت شاقہ سے کام لیکر اس طریق علاج کا نہ صرف مطالعہ کیا ہے بلکہ اس میں بعض نغرا عات سے بھی کام لیا ہے۔ موصوف نے بڑے بڑے معرکے کے علاج کئے ہیں اور اگر کوئی صاحب اُن کا مشورہ حاصل کرنا چاہیں تو ۲۳۱ احاطہ آغا تراب خاں لکھنؤ کے پتہ سے خط و کتابت کر سکتے ہیں

(اڈیٹر)

علاج باالغسل کی تاریخ میں مسٹر لوئی کوہنی کا نام زرّیں حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے نہ اس لئے کہ وہ اس کے موجد ہیں۔ بلکہ صرف اس لئے کہ انھوں نے اس میں بہت مفید اضافہ کیا اور چہرہ کو دیکھ کر تشخیص مرض کا بالکل جدید نظریہ پیش کیا

پانی کے ذریعہ سے امراض دور کرنے کا طریقہ زمانہ قدیم ہی میں معلوم ہو چکا تھا اور غالباً یہ ایجاد انسان کے عہد وحشت کی پہلی ایجادوں میں سے ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسیریا، قدیم مصر، ہندوستان

ایران اور یونان میں اس علاج کا رواج پایا جاتا تھا۔ ہندوؤں کی معاشرت و مذہب میں پانی کا کثیر استعمال اور دریاؤں کا احترام وغیرہ سب اس کی یادگار ہیں

مسیح سے کئی صدی قبل چین کی قدیم تاریخ سے اس کا وہاں رائج ہونا پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک بار وہاں کے کسی معالج نے ایک عورت کا علاج برف کے پانی سے کیا تھا۔ یعنی نہایت سرد پانی سے سینکنے کے بعد خشک کپڑا اس کے چاروں طرف لپیٹ دیا تھا۔ چنانچہ زمانہ موجودہ میں بھی پانی سے بھگوئی ہوئی ایک چادر لپیٹ کر اوپر سے خشک کمل لپیٹنا اس طریق علاج میں رائج ہے

جاپان میں ٹوکیو سے جو اوس کا صدر مقام ہے ایک میڈیکل جرنل نکلتا تھا۔ ۱۸۸۱ء کے اس جرنل میں وہاں تقریباً ۸۰۰ سو برس پہلے ٹھنڈے غسلوں سے علاج کیا جانا تحریر تھا۔ تقریباً چار سو برس گذرے ہوں گے کہ ڈاکٹر "ناکہ گامی" (Dr. Naca Gami) نے ٹھنڈے غسلوں کے خواص کے متعلق ایک چھوٹی سی کتاب شایع کی تھی۔ اوس میں اونھوں نے دمہ۔ امراض اطفال۔ ہسٹریا اور دیوانگی وغیرہ میں ان غسلوں کی بڑی سفارش کی تھی

قدیم اسپارٹا میں ان غسلوں کے لئے خاص قانون مقرر تھا۔ اور اہل روما میں بھی ان غسلوں کی طرف بڑی توجہ کی جاتی تھی۔ روما کے غسل خانے اتنے وسیع ہوتے تھے کہ ان میں ہزاروں آدمی نہا سکتے تھے۔ اور ان میں علاوہ ٹھنڈے اور گرم غسل کے بھاپ اور گرم ہوا کے ذریعہ سے بھی غسلوں کا انتظام رہتا تھا۔ وہ لوگ تالاب کے کھولنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کیا کرتے تھے

ہپوکریٹیس (Hippocretes) پانی کے خواص کا بڑا ماہر تھا، ...... اور بخار، پھوڑا، پھنسی، اور تقریباً تمام امراض میں ٹھنڈے اور گرم دونوں قسم کے غسل سے علاج کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ سرد پانی سے غسل کرنے کے بعد جسم جلد گرمی حاصل کر لیتا ہے اور گرم بنا رہتا ہے لیکن گرم پانی کا اثر اس کے خلاف ہوتا ہے۔ اوس کا یہ بھی اصول تھا کہ سرد پانی کا غسل تھوڑی دیر ہونا چاہیے اور اوس کے بعد بدن ملنا چاہیے

ایسلیپیڈوس (Asclepiades) ٹھنڈے اور گرم غسل کے علاوہ پٹیاں بھی استعمال کرتا تھا۔ اوس کے شاگرد اینٹونیس (Antonius) نے اس علاج میں بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ شہنشاہ آگسٹس (Augustus) کا زکام کہنہ اوہی کے ٹھنڈے غسلوں سے اچھا ہوا تھا۔ شہنشاہ مذکور کا بھتیجہ نیپلس (Naples) میں بیئی (Baiai) کے گرم غسل خانہ میں علاج کے لئے گیا تھا۔ انٹونیس (Antonius) کے علاج غسل سے شاعر ہوریس (Horace) کو شفا ہوئی تھی

پیسٹر نیپ (Pastor Kneipp) قدیم بیوریا کے ڈاکٹر اپنے علاج میں پٹیوں وغیرہ کا بھی استعمال کرتے تھے

پلنی (Pliny) کے بیان کے مطابق پانچ سو برس تک یہ طریق علاج روم میں بکثرت رائج رہا

سیلسس (Selcus) اور دوسرے مشہور معالج اپنی تصنیفات میں غسلوں کی بڑی تعریف لکھ گئے ہیں۔ سیلسس (Selcus) نے اسے کامل طریق علاج بتایا اور اس کے ساتھ ورزش اور الشس وغیرہ بھی شامل کی

عرب کے اطباء نے بھی اس طرف خاص توجہ کی چنانچہ چیچک اور بخار کے بارے میں جو غسل وہ تحریر کر گئے ہیں اس وقت تک اون میں اضافہ نہ ہو سکا

رہیزیز (Rhazez) لکھتا ہے کہ بخار کو کم کرنے کے لئے جلدی جلدی ٹھنڈا پانی پینا مفید ہے

بو علی سینا (Avicena) قبض دور کرنے کے لئے ٹھنڈے پانی کی سفارش کرتا تھا۔ لوائیں (Lyons) کے رہنے والے سٹر بارا (Bara) نے گھلی ہوئی برف پینے اور پانی سے بھرے ہوئے برتنوں کو پیال اور تنکے وغیرہ سے ڈھک کر ان کو ٹھنڈا رکھنے کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اوس نے ۱۶۱۸ء میں ایک کتاب شایع کی۔ جس میں کہ اس نے جملہ امراض کہنہ وامراض متعدیہ مثلاً طاعون و دق وغیرہ میں اس علاج کی سفارش کی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ ٹھنڈا پانی بہترین دوا ہے

اٹلی کے طبیب لنزائن (Lanzine) نے اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں پانی کے اندرونی استعمال اور اس کے ذریعہ سے تپ دور کرنے کے باب میں ایک عمدہ کتاب مرتب کی تھی۔ فرا برنیرڈ ینو (Fra Bernerdino) کا نام ہی "ٹھنڈے پانی کا ڈاکٹر" ہو گیا تھا۔ وہ بدہضمی عصبی امراض، اور سیلان الدم کا علاج برف سے کرتا تھا

جان وسلی ایم۔ اے (John Wesley M.A.) نے ۱۷۴۷ء میں ایک کتاب شایع کی جس کا نام پریمیٹیو فیزیک (Primitive Physic) تھا۔ اس کتاب میں پانی کے استعمال سے امراض دور کرنے کی جو تدابیر بتائی ہیں۔ اون سے ظاہر ہوتا ہے کہ پانی کی صحت بخش خصوصیات اوس وقت بھی معلوم تھیں وہ لکھتا ہے کہ

(۱) میعادی بخار میں جاڑا معلوم ہونے سے پہلے ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا، اور ٹھنڈا پانی پینے کے بعد اوڑھکر لیٹ رہنا۔ فرانس اور جرمنی میں اب بھی رائج ہے

(۲) معمولی بخار میں کم اور زود ہضم غذا کھانا، اگر زیادہ کمزوری نہ ہو اور ضعیفی بھی نہ ہو تو ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا

اور جاڑا معلوم ہونے سے قبل اوڑھ کر لیٹ جانا اور تھوڑا تھوڑا وقفہ دے کر لیمو ڈال کر پانی پینا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں رائج تھا۔ اور جب کونین وغیرہ ناکامیاب ہوتی تھیں تو اس سے فائدہ ہوتا تھا

(۳) مرگی میں بھی ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا اور سرد پانی پینا مفید ہے

(۴) دمہ میں روزانہ صبح ٹھنڈا پانی پینا۔ پھر فوراً ہی ٹھنڈے پانی سے سر دھو ڈالنا۔ اور ہفتہ میں ایک بار ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا مفید ہے۔ فوری دفع تکلیف کے لئے تھوڑا گرم پانی پی کر تے کر ڈالنا کارآمد ثابت ہوا ہے

(۵) خشک دمہ کے لئے ہفتہ میں تین بار ٹھنڈے پانی سے غسل کرنا از بس سودمند ہے

(۶) چوٹ کا آماس روکنے کے لئے، فوراً پانچ چھ تہ کپڑا کر کے اوسے ٹھنڈے پانی میں بھگو کر لپیٹنا۔ اور جب گرم ہو جائے تو پھر ٹھنڈے پانی میں بھگو کر لپیٹنا مفید ہے

(۷) چوٹ سے اگر آماس پیدا ہو جائے۔ آدھ گھنٹہ تک صبح و شام گرم پانی میں کپڑا بھگو کر سینکنا فائدہ مند ہے

(۸) آگ سے جل جانے کی حالت میں جلے ہوئے حصہ کو ٹھنڈے پانی میں ایک گھنٹہ سے لے کر چار پانچ گھنٹہ تک ڈبوئے رکھنا فائدہ پہونچاتا ہے

کلین (Cullen) نے بھی پانی کے استعمال پر ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ ڈاکٹر ڈارون (Dr. Darwin) کے اصول پر کام کرتے تھے۔ وہ جاڑا لگنے پر گرمی پہونچاتے تھے۔ اور گرم ہو جانے پر ٹھنڈک پہونچاتے تھے

سر جان فلائر (Sir John Flayer) نے سترہویں صدی کے آخر میں پانی سے بھیگی ہوئی چادر لپیٹ کر علاج کرنے کا ذکر کیا ہے، اوس نے لکھا ہے کہ انگلینڈ میں بھی لوگ اس کے عادی تھے لیکن اوس کی شکل کچھ اور تھی

سر جان سنکلیر (Sir John Sinclair) نے بھی اس پر ایک کتاب لکھی تھی

پندرہویں صدی میں اٹلی کے طبیب سیوائرولا (Savoiraola) بریزی (Bairizzi) اور بیکیو (Baccio) ٹھنڈے پانی کا بکثرت استعمال کرتے تھے

اوس وقت اسپین اور جرمنی میں اس کا بڑا رواج تھا۔ سترہویں صدی میں سپٹلا (Septala) درد سر اور لو لگ جانے میں ٹھنڈے پانی سے کام لیتا تھا۔ بلجیم (Belgium) کے طبیب ہرمین (Herman) ٹھنڈے پانی سے کل امراض اچھے کرتے تھے

سر جان فلائر (Sir John Flayer) مذکور نے سنہ ۱۶۹۷ء میں غسلوں کا پورا حال لکھا

انھوں نے لچفیلڈ (Litchfield) واقع انگلینڈ (England) میں ایک پانی کا شفاخانہ بھی کھولا - جس میں گرم و سرد غسل اور خشک لپیٹ کا باقاعدہ انتظام تھا

اوس کے بعد سنہ ۱۷۲۳ء میں جان ہینکاک (Hancock) نے بھی غسل پر ایک کتاب لکھی وہ مریض کو زیادہ پانی پلاکر اور کمبل میں لپیٹ کر پسینہ لاکر علاج کرتے تھے. انھوں نے لکھا ہے کہ لال بخار میں ٹھنڈا پانی پینا بہت مفید ہے

سرجان چارڈن (Sir John Chardin) اٹھارھویں صدی کے ایک مشہور انگریزی سیاح تھے، وہ ایران پہونچ کر میعادی بخار میں مبتلا ہوئے - اون کے ساتھ ایک فرانسیسی سرجن بھی تھے جو اون کی نازک حالت دیکھ کر گھبرا گئے - اونھوں نے فوراً ایک ایرانی طبیب بلایا - اس نے مریض کو پانچ فاقہ کرائے - اور فاقہ کی حالت میں برف سے ٹھنڈا کیا ہوا پانی کثرت سے پینے کو دیا - اسی کے ساتھ پانی سے بھیگی ہوئی چٹائی میں لپیٹ دیا - اور اسے پانی سے تر رکھا - جس سے دو ہی دن میں بخار غائب ہوگیا

اٹھارھویں صدی کے آخر میں کری اور جیکسن (Currie & Jackson) دو مشہور انگریزی طبیب ہوئے ہیں - اونھوں نے اس کی بڑی چھان بین کی - اور اچھی کامیابی حاصل کی اونھوں نے اس پر کتابیں بھی لکھیں

سنہ ۱۷۹۰ء میں آسٹریا (Austria) کے گریفن برگ (Grafenburg) میں ایک چھوٹے سے گاؤں سلیسیا (Silicia) میں ونسنٹ پرسنیز (Vincent Priessnitz) کی پیدایش ہوئی - چونکہ یہ گاؤں کے رہنے والے تھے انگریزی کتابوں میں ان کے لئے صاف صاف گنوار لفظ استعمال کیا گیا ہے - لہٰذا ناظرین بھی اونھیں گنوار ہی سمجھ لیں یہی گنوار آدمی تھا جس کو پانی کے علاج کی دھن سوار ہوئی اور اوس نے اوس میں کافی تجربہ حاصل کیا

یہاں پر یہ بھی بتلا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پرسنیز (Preissnitz) کو ایسی کیا مصیبت پڑی تھی جس کی وجہ سے وہ پانی کی خوبیاں آزمانے پر مجبور ہوئے - اس کا واقعہ یوں ہے کہ جب اون کی عمر فقط سترہ برس کی تھی - ایک حادثہ سے ان کے جسم میں کئی جگہ چوٹ آئی - اور دو پسلیاں بھی ٹوٹ گئیں - موجودہ طبیبوں نے صحت ہونے سے پورا جواب دے دیا - چونکہ اونھیں اپنے مویشیوں کا علاج کرنے میں پانی سے اکثر کام لینا پڑتا تھا - اس لئے اونھوں نے وہی طریقہ عمل اپنے اوپر بھی استعمال کیا یعنی چوٹ کھائی ہوئی جگھوں کو بھیگے ہوئے کپڑے سے ڈھک دیا - اور اونھیں برابر تر رکھا - تھوڑے عرصہ میں اوسے پوری صحت حاصل ہوگئی - اس حیرت انگیز کامیابی کو سنکر لوگ اون کے پاس دور دور سے آنے لگے

اوران کا تمام وقت مریضوں کی تیمار داری میں گذرنے لگا۔ اُن کے اس کام سے خوش ہو کر حکومت آسٹریا نے اون کو سند عطا کی اور اس کے بعد فرانس کے فوجی علاج میں بھی پانی سے کام لیا جانے لگا۔ فرانس گورنمنٹ نے اپنے آدمی ان کے پاس یہ علاج سیکھنے کے لئے بھیجے اور اوسے اپنے یہاں رائج کیا۔ اس کے بعد مسٹر فلوری (Mr. Fleury) نے ایک بہت عمدہ باقاعدہ پانی کے علاج پر کتاب لکھی۔ یہ کتاب ۱۸۵۲ء میں شایع ہوئی۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے باقاعدہ تحقیق کرکے اپنے تجربات قلمبند کئے

امریکہ میں بھی زمانہ قدیم سے اس طریق علاج کا رواج چلا آتا تھا۔ چنانچہ فلیڈیلفیا (Philadelphia) میں ڈاکٹر بنجیمن رش (Benjamin Rush) گٹھیا۔ چیچک خسرہ زرد بخار و دیگر بیماریوں کا علاج ٹھنڈے پانی سے کرتے تھے ۱۷۹۴ء میں اونھوں نے بخار میں برف کی تھیلی سر پر رکھنا ایجاد کی۔ اوس میں اونھیں بڑی کامیابی ہوئی

ڈاکٹر بارڈ (Dr Bard) اور ڈاکٹر ہوسک (Dr. Hosack) دونوں نے نیویارک (New York) کے اسپتال میں ۱۷۹۵ء سے ٹھنڈے پانی کا استعمال شروع کیا۔ مسٹر کری (Mr. Kurry) کی کتاب اوس کے تین چار سال بعد امریکہ پہونچی ——

۱۷۹۹ء میں آگسٹہ (Augusta) کے پیٹر ایڈس (Peter Edas) نے اوس کتاب میں اپنے تجربات ملا کر دوسری کتاب مرتب کی۔ ایک دوسرے امریکن مصنف نے ۱۸۰۰ء میں سوجن کے لئے اور فاسد مادّہ سے بھرے ہوئے مقام پر گیلی پٹی باندھنا ایجاد کیا

گوتم بدھ نے ایک مرتبہ مگدھ دیش میں اپنے ایک شاگرد سے کہا تھا کہ گیلی مٹی اور گوبر سے سانپ کا زہر دور کیا جاسکتا ہے۔ پانی کی طرح مٹی کا اثر بھی ہزاروں برس پہلے معلوم کر لیا گیا تھا۔ جس کے ہزارہا ثبوت ہیں

پانی کی عجیب و غریب فوقیت معلوم کرنے کے بارے میں ورجینیہ (Virginia) کے ہنری ولسن لاکیٹ (Henry Wilson Locket) کے تجربات قابل تعریف ہیں۔ اون کے تجربات ۱۸۰۱ء میں شایع ہوئے تھے۔ وہ ایک کتاب کی صورت میں پنسلوینیہ (Pennyslovania) کی یونیورسٹی میں پیش ہوئے تھے۔ وہاں سے اونھیں ڈاکٹر اف میڈیسن (Doctor of medicine) کی ڈگری عطا ہوئی تھی

ویدوں میں سے ایک اجورویدبھی ہے اور اس میں بھاپ کے ذریعہ سے علاج کرنے کا حال بتایا گیا ہے ڈاکٹر لاکٹ (Dr Lockette) کے تجربات سے متاثر ہو کر ڈاکٹر دوویٹ (Dwight)

نے بہت سے کامیاب علاج اسی طرح کئے۔ اس کے بعد فلیڈیلفیہ (Philadelphia) کے ڈاکٹر جان بل (John Bull) نے اس میں اور ترقی کی اور ایک دوسری کتاب موسومہ باتھس (Baths) مرتب کی۔ یہ کتاب انگریزی میں اب تک موجود ہے

انیسویں صدی کے نصف حصہ میں لیبر میسٹر (Liebermeister) برانڈ (Brand) زیمیسن (Ziemesen) باشندگان جرمن اور ونٹر منٹز (Winter mintz) باشندہ ویانا (Vienna) نے فلیوری (Flury) کی تصنیفات پر نظر ثانی کی امداد سے زیادہ مرتب شکل میں پیش کیا

ہندوستان میں سب سے پہلے پنڈت شاستری نے مہاراجہ جے پور کا علاج کیا تھا۔ وہاں سے اونھیں قریب تین لاکھ روپیہ عطا ہوا تھا۔ اونھوں نے ڈیڑھ لاکھ روپیہ صرف کرکے راجپورا میں پہلا قدرتی صحت گاہ (Nature cure clinic) کھولا۔ اوس میں اونھیں کافی کامیابی بھی ہوئی تھی۔ لیکن اس کے تین ہی برس بعد وہ انتقال کر گئے

پنڈت کرشن سروپ سونی۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی وکیل مرادآباد نے بھر مسٹر کونے کی مرتبہ کتاب دی نیو سائنس آف ہیلنگ (The new science of healing) کا ترجمہ اُردو و ہندی میں کیا لوگوں کی کافی امداد کی۔ دو تین سال ہوئے انتقال کر گئے

مسٹر جواجی کرشنا راؤ ساکن مدراس نے بھی اس سے لوگوں کو کافی فائدہ پہونچایا

مہاتما گاندھی نے بھی اسے قبول کیا۔ اور وہ اس کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سنڈ لیر ایم ڈی (Dr Lind Lair M.D) کو جب اونھوں نے خط لکھا تھا۔ تو اس کی بڑی تعریف کی تھی

پہاڑوں کے بعض وحشی قبائل میں دستور ہے کہ جب اون کے یہاں کوئی شخص بیمار پڑجاتا ہے تو شام کو گاؤں بھر میں سب کو خبر کردی جاتی ہے۔ صبح یا دوپہر کو جیسا وہ لوگ آپس میں طے کریں سب لوگ اپنے اپنے یہاں سے ایک ایک گھڑا تازے پانی سے بھر کر مریض کے گھر جاتے ہیں۔ گھر والے مریض کو لاکر ایک پرنالے کے نیچے برہنہ بٹھلادیتے ہیں اور اوسے پکڑے رہتے ہیں۔ گاؤں والے ایک ایک کرکے دھار باندھ کر گھڑے کا پانی اوس کے سر پر ڈال کر چلے جاتے ہیں۔ اگر ضرورت ہوتی ہے تو دوسرا گھڑا پھر بھر لاتے ہیں۔ وہ لوگ مریض کے رونے چلانے کی پرواہ نہیں کرتے۔ جب اون کے اندازے کے مطابق پانی گرچکتا ہے تو مریض کو خوب پونچھ کر رضائی وغیرہ میں لپیٹ کر لٹا دیتے ہیں۔ مریض کو پسینہ آجاتا ہے۔ اور وہ اچھا ہوجاتا ہے۔ پسینہ لانے کے لئے جنگل کی کچھ پتیاں ڈال کر پانی کو گرم کرتے ہیں۔ ایسی بھاپ کا ذکر آیورویدک و حکمت کے گرنتھوں میں بھی ہے

اتنے بیان سے ناظرین پر غالباً یہ امر واضح ہوگیا ہوگا کہ پانی اور مٹی کا علاج نہایت قدیم علاج ہے اور اس کے فوائد سے انکار نہیں ہوسکتا، لیکن چونکہ یہ فن عہدِ وسطیٰ میں مٹ چکا تھا۔ اس لئے اب وہ لوگوں کو بالکل نئی چیز معلوم ہوتا ہے

میں نے چونکہ اپنی عمر کا بڑا حصہ اس طریق علاج کی تفتیش وتحقیق میں صرف کیا ہے اور دنیا میں پھر اس طرف لوگوں کو توجہ ہو چلی ہے۔ اس لئے میں نے جسارت کی کہ جو کچھ اس باب میں میری معلومات ہیں انھیں قلمبند کردوں، ممکن ہے میری یہ خدمت اب یا آیندہ کسی وقت کارآمد ثابت ہو

یہاں تک جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ تاریخی نقطۂ نظر سے تھا آیندہ میں اس کے اصول اور طریقِ علاج پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے خود اپنے ذاتی تجربات بھی پیش کروں گا

نربدا پرشاد (سریواستوا)

رسالۂ جن کے گزشتہ پرچے

بہ حساب ایک آنہ (۱ر) فی پرچہ ٹکٹ بھیج کر طلب فرمائیے۔ رسالۂ جن اپنے موضوع کے لحاظ سے ہندوستان میں پہلا پرچہ تھا جو اڈیٹر نگار کی ادارت میں دو سال تک نکلتا رہا

ان پرچوں میں جس قسم کے مضامین نکل چکے ہیں۔ وہ اب کبھی میسر نہیں آسکتے

منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

نیاز نوازا!

دنیائے شاعری میں تو یہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ ذرا سی لغزش پا انسان کو خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچا دیتی ہے اور اسی لیے نہایت ہی شوق و ولولہ کے ساتھ یہ تمنا بھی کی جاتی ہے کہ

من ویک لغزش پائے تو وقطع منازلہا

لیکن اس "دو اور دو چار" کی دنیا میں کسی غلطی کا زندگی کی کسی "حقیقت" میں تبدیل ہو جانا شاذ و نادر ہی کبھی دیکھا جاتا ہے —— اگر اجازت ہو تو اپنی اس غلطی کو بھی انھیں "نوادر" میں شمار کر دوں۔ ممکن ہے "اظہار تشکر" والی خاتون پر آپ کو برہمی ہو، لیکن کم از کم میں تو ان کا ازبس ممنون ہوں کہ "آگ کی جستجو میں جانا اور پیمبری لے کر پلٹنا" موسیٰ کے بعد سے اس وقت تک تو کبھی دیکھا نہیں گیا

آپ کا خط پڑھنے کے بعد دو متضاد کیفیتیں مجھ پر طاری ہوئیں، ایک مسرت و انبساط کی دوسری تاسف و برہمی کی —— وہ اس لئے کہ آپ کی تحریر میں مجھ کو وہ سب کچھ نظر آیا جو کسی ہستی کو ادبی دنیا میں "پرستیدۂ عالم" بنا سکتا ہے اور یہ اس لئے کہ میں کیوں اس وقت تک آپ سے بے خبر رہا۔ اور آپ کی ان بیش بہا فطری ودیعتوں کو کیوں نہ بروئے کار لا سکا

مجھے ایک زمانہ سے تمنا ہے کہ نگار کسی ایسی خاتون کو پیش کر سکے جو دنیائے ادب میں عورتوں کے لئے صحیح نمونہ بن سکے، لیکن اس وقت تک کامیاب نہ ہو سکا —— ایک اور صرف ایک ملیں بھی تو "موج کوثر و تسنیم" والی کہ "خراب محبت" ہونے کی وجہ سے شاعری میں تو یقیناً ان کا جواب نہیں، لیکن یوں وہ ایک پتھر کی دیوی ہیں جس کے سامنے سر تو پھوڑا جا سکتا ہے لیکن زبان نہیں ہلائی جا سکتی ——

بہرحال آپ کی تحریر پڑھنے کے بعد میری یہ دیرینہ تمنا پھر از سر نو زندہ ہو گئی ہے۔ اور کس قدر جی چاہتا ہے کہ آپ اور آپ کی ادبیت نگار کے لئے مخصوص ہو جائے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس وقت تک آپ نے کیا لکھا

اور کہاں لکھا، لیکن یہ سمجھتا ہوں کہ آپ نے جو کچھ لکھا ہوگا - خوب لکھا ہوگا یا خوب لکھنے کے تمام آثار اس میں پائے جاتے ہوں گے - اس لئے اگر کوئی حرج نہ ہو تو مجھے اپنے تمام ادبی مشاغل اور انہماک ذوق سے بے خبر نہ رکھئے، اور کوئی مقالہ لکھ کر میرے پاس بھیجد بجئے تاکہ میں پورا اندازہ کرکے آپ کو صحیح مشورہ دے سکوں

.... میں گیارہ سال تک رہنے کی وجہ سے مجھے وہاں کی ہر چیز سے اُلفت ہے، اس لئے یہ معلوم کرکے کہ آپ کا تعلق اسی سر زمین سے ہے، یوں بھی ایک خاص کشش آپ میں پاتا ہوں - اور متمنی ہوں کہ اس حد تک ضرور آپ مجھ سے بے تکلف ہو جائیے کہ اس بُعد مکانی کو میں اپنے تصور و خیال کی مدد سے دور کر سکوں

نیاز

رسیا،

کہو کب مرزا پور سے واپس آئے اور ساون کی مست و سیاہ راتوں میں کس کس کے ساتھ جھولا جھولے، کہاں کہاں "کجری" سنی ــــ حقیقت یہ ہے کہ تم سے بے حس بھی کم دیکھنے میں آتے ہیں، غضب خدا کا اس دلکش موسم میں پورب کی نازک، البیلی، چھریری، سبزہ رنگ صحبتوں کو چھوڑ کر علی گڈھ آجاؤ - سچ ہے، تم کیا کرو،

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

اچھا تو اس کی سزا سنئے ــــــ آپ کو معلوم ہے کہ سید صاحب کو میں نے لکھ دیا تھا کہ اس زمانہ میں آپ کو فرصت نہ ہوگی، لیکن چونکہ آپ وہاں سے قبل از وقت واپس آگئے ہیں، اس لئے اب آمادہ ہو جائیے - اور جس طرح ممکن ہو ان کی کوششوں کو کامیاب بنائیے

ہر چند میں جانتا ہوں کہ ہزاروں عذر آپ کی طرف سے پیش ہوں گے، لیکن یہ آپ بھی خوب جانتے ہیں کہ میں ایک ماننے والا نہیں ــــ پھر وقت ضایع کرنے سے فائدہ ؟

میں انھیں خط لکھ رہا ہوں، دو چار دن میں آپ کے سر پر مسلط ہو جائیں گے نیاز

سنئے صاحب

آپ لاکھ میرے دوست سہی، لیکن بہرحال دشمنی اُن سے بھی تو نہیں ہے، اس لئے معاملہ اگر بالکل "سخن گسترانہ" آپڑا ہے، تو میں کیوں کسی کی خودداری کو صدمہ پہونچاؤں

میں زیادتی و یادتی کچھ نہیں جانتا، میرے سامنے تو صرف "ادا" ہوا کرتی ہے، خواہ وہ کتنی ہی سرکشانہ کیوں نہ ہو، میں شیطان سے صرف اس لئے محبت رکھتا ہوں کہ اس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا، پھر

تمھیں انصاف کرو کہ میں انھیں کیونکر مجبور کر سکتا ہوں کہ وہ وہاں جا کر معذرت پیش کر دیں۔ اور کیوں نہ کریں، جبکہ واقعی ابتدا ان کی طرف سے نہیں ہوئی، آپ اُن کی غربت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائیے۔ دنیا میں مفلس و نادار ہونا کوئی عیب نہیں، اگر فاقہ کر کر کے مرجانے کی داستان میں کوئی ٹکڑا دستِ سوال پھیلانے کا نہ ہو۔ مانا کہ آپ کے چچا جاہ و ثروت والے ہیں، رئیس ہیں، حکام رس ہیں، شہر میں خاص اثر رکھتے ہیں، لیکن میرے عزیز دوست، عزت کا سودا یوں نہیں ہوا کرتا۔ میرزا صاحب غریب ہیں، بیکس و محتاج ہیں، لیکن بتائیے اگر کبھی ایک پیسہ کا احسان آپ کے چچا کا انھوں نے لیا ہو۔ پھر میاں، تمھیں تو ایسے شخص کی عزت کرنا چاہیے اور فخر کرنا چاہیے کہ تمھارے محلہ میں ایک آدمی تو اس آن بان کا ہے۔ معاف کرنا، میں تمھیں سے پوچھتا ہوں کہ تمھارے چچا کا بھری محفل میں میرزا صاحب کی طرف اشارہ کر کے یہ کہنا کہ " وہ میرے پاس کیوں آنے لگے، بڑے آدمی ہیں " کیا معنی رکھتا تھا اور اگر اس پر انھوں نے یہ کہہ دیا کہ " میں اگر بڑا آدمی ہوتا تو خود چھوٹوں کے پاس جایا کرتا،" تو کیا برا کیا۔ بیشک اس فقرہ میں طعن ہے اور سخت طعن ہے، لیکن کیا تمھارے چچا نے پہلے اُن کو چھوٹا آدمی نہیں کہا اور وہ بھی صرف اس لئے کہ بیچارے غریب ہیں ——— بہرحال میں قیامت تک اُن سے معذرت کے لئے اصرار نہ کروں گا اور کروں بھی تو کیا فائدہ مجھے معلوم ہے کہ وہ کبھی راضی نہ ہوں گے۔

میری رائے تو یہی ہے کہ اس معاملہ کو آگے نہ بڑھنے دو اور اپنے چچا کو سمجھا دو، میرزا صاحب کا تباہ کر دینا مشکل نہیں، لیکن شاید یہ کوئی قابلِ عزت کارنامہ تم لوگوں کا نہ ہوگا

نیاز

" مبارک، مبارک " ——— تو میں زبان سے لاکھ بار کہہ دوں، لیکن دل کو کیا کروں کہ وہ زبان کا ہم نوا نہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ آپ بیٹے کی شادی کر رہے ہیں یا اس کی دستار بندی کا جلسہ ہے کہ سوائے مولویوں اور واعظوں کے کسی دوسرے کو شرکت کی اجازت ہی نہیں۔ تم کہو گے کہ اجازت کیوں نہیں، شہر میں کون ہے جو مدعو نہیں کیا گیا

ہاں، ہاں صاحب فہرست میں نے بھی دیکھی ہے، تقریب کا پروگرام میری نگاہ سے بھی گزر چکا ہے، لیکن مجھے تو اس میں نہ پٹنہ کی زہرہ جان کا نام کسی جگہ نظر آیا نہ کلکتہ کی گوہر جان کا، نہ کہیں آتشبازی کا ذکر ہے نہ طبل و شہنائی کا

یہ آپ کے بیٹے کی شادی ہو رہی ہے یا کراماً کاتبین کی کہ ادھر کسی گناہ کا نام آیا اور وہ شادی کے جلسہ سے اٹھ کر بھاگ کھڑا ہوا ——— سنئے یہ مولوی لوگ جو شادی کی تقریبوں میں ناچ گانے کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس سے مدعا درستیِ اخلاق نہیں ہوتا بلکہ صرف یہ کہ مدرسہ و مسجد کے نام سے ان کو لذت کام و دہن کا سامان میسر آ جائے گا،

پھر میں یہ نہیں کہتا کہ مولویوں کو منہ نہ ضرور دو لیکن یہ سمجھ لو کہ جس طرح مولانا سعید الدین صاحب کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے، اسی طرح شیر یزدجان کو بھی ہے یعنی اگر مسجد میں اذان دینے کے لئے ان کی ضرورت ہے، تو روح کی خستگی دور کرنے کے لئے یہ بھی کم ضروری نہیں ——— بہرحال میں شریک ہوتا نہیں، کیونکہ یہیں گھر میں کیا کم ویرانی ہے کہ وہاں شادی میں شرکت کروں

مہربان بندہ

آپ نے ایک ایسے مسئلہ میں مجھ سے مشورہ طلب کیا ہے کہ اس کی موافقت و مخالفت دونوں میں لوگوں کے پاس کافی دلائل موجود ہیں ——— میں خود کوئی رائے اس وقت تک اس لئے قائم نہیں کر سکا کہ یہ خوش نصیبی ابھی تک حاصل نہیں ہوئی۔ ایک بیوی کے مر جانے کے بعد دوسری شادی کرنا ظاہر ہے کوئی شرعی گناہ تو ہے نہیں، لیکن اخلاقی و معاشری معصیت ضرور ہے اگر کسی کے حالات اس کے مقتضی نہیں۔ وہ لوگ جو فطرتاً اہلی زندگی کے اہل نہیں ہیں یعنی جو حقوق زناشوئی کی طرف سے بے پرواہ ہیں ان کا تو خیر سوال ہی نہیں، لیکن آپ ایسے لوگوں کے لئے جو زندگی صرف اپنے لئے بسر نہیں کرتے، یقیناً "مسئلہ غور طلب ہے"

اگر آپ کی بیوی کوئی اولاد نہ چھوڑ جاتیں تو بھی کوئی جھگڑے کی بات نہ تھی، لیکن جبکہ ایک چھوڑ ماشاء اللہ تین اولاد آپ کی موجود ہیں، عقد ثانی کے مسئلہ پر ایسی آسانی سے رائے زنی نہیں ہو سکتی۔ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ محض بچوں ہی کی وجہ سے دوسری شادی ضروری ہو جاتی ہے اور کبھی انہیں کی وجہ سے عقد ثانی حرام ہو جاتا ہے ۔مجھے جہاں تک معلوم ہے آپ کی بڑی بچی اچھی طرح گھر سنبھال سکتی ہے۔ اس لئے انتظام خانہ داری کا سوال ابھی اول پیدا نہیں ہوتا، جب اس کی شادی ہو گی تو اس وقت تک آپ کی بہو گھر میں آجائے گی اور دوسری بچی اس بار کے اٹھانے کے قابل بن جائے گی۔ اس لئے اب سوال صرف آپ کی ذات کا رہ جاتا ہے، سو مجھے معلوم ہے کہ اس باب میں آپ ہمیشہ بہت محتاط رہے ہیں اور یہ جذبہ کبھی آپ پر غالب نہیں ہوا

عمر طبیعی تک پہونچنے کے لئے زیادہ زمانہ درکار نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس سال، پھر آپ کیوں الجھنوں میں گرفتار ہوں اور علائق بڑھا کر اپنے سکون کو خراب کریں ——— لیکن اگر کسی خاص سبب کی بنا پر مجبور ہی ہو جائیں تو پھر کوئی سن رسیدہ بیوہ تلاش کیجئے جس کے کوئی اولاد نہ ہو

ادھر آؤ، تمہارا منہ چوم لوں، واللہ کیا خبر سنائی ہے۔ دل خوش ہو گیا۔ ایک ایک بال پر پھول رہا ہے خود دولہا بنا ہوا ہوں، اور اتنی مسرت ہوئی کہ تمہیں لکھتا کہ یا تو میرا دم نکل جاتا یا میرا خدا کے لئے مفصل حال لکھ کر یہ سب

کچھ ہو اکیونکر، یہ محال کو ممکن بنانے والا دلی کون تھا، ذرا میں بھی تو اس کا نام سنوں۔ معاذاللہ جس وقت گزشتہ زمانہ کا خیال آجاتا ہے تو کلیجہ کانپ اٹھتا ہے، کس بلا کا کرب تھا، کس قیامت کی تکلیف تھی اور واقعہ یہ ہے کہ مجھے کوئی امید کامیابی کی نہ تھی اور ڈرتا تھا کہ خدا جانے کس دن کیا خبر سننے میں آئے۔ بارے شکر ہے کہ وہ دور ختم ہو گیا اور تمھاری تحریر پڑھکر جان میں جان آئی۔

ہائے کتنا جی چاہتا ہے کہ صبح ہجراں میں دم توڑنے والوں کو، شام وصال کی زندگی کا مژدہ خود آکر سناؤں، اور خود اپنی آنکھوں سے دیکھوں کہ وصل و فراق کی بیتابیوں میں کیا فرق ہوتا ہے، لیکن کیا کروں سخت مجبور ہوں۔ بہرحال ان کے پاس جاؤ میری طرف سے ایک کے لب اور دوسرے کی پیشانی چوم کر یہ خط دکھا دو ــــــ پھر جو کچھ وہ کہیں۔ کہیں گے کیا صرف مسکرا دیں گے ــــــ مجھے لکھنا نہیں بلکہ خود کبھی آکر سنا دیا۔

کیسا کلیات، کہاں کا مجموعۂ نظم؟ کچھ پاگل ہو گئے ہو ــــــ تمھارے حُسنِ ظن کی تسکین کے لئے میں ملک میں رسوا ہو جاؤں، یہ کہاں کی دانشمندی ہے۔ اوّل تو میرے پاس مجموعہ موجود نہیں اور اگر کوشش کر کے متفرق نظمیں یکجا کر لی جائیں تو بھی ان کی اشاعت کی کیا صورت ہے ــــــ میں جب شاعر تھا تو بدقسمتی سے بُرے بھلے کی تمیز نہ تھی، اب جو اس کا سلیقہ آیا تو دنیا کی شاعری نگاہوں سے گر گئی، خود میرا کیا ذکر ہے اس میں شک نہیں کہ اول اول میں نے بہت جھک مارا اور دنیا نے اس کی داد بھی کافی دی لیکن باور کرو حقیقی شاعر میں کبھی نہیں تھا۔ ذوقِ شعر و سخن ضرور رکھتا تھا، سو اس میں بیشک غیر معمولی ترقی محسوس کرتا ہوں۔ یہاں تک کہ اب صرف نقاد ہو کر رہ گیا ہوں اور اپنی گرہ میں کچھ ہو یا نہ ہو لیکن دوسروں کے زرِ عیار کو فوراً پہچان لیتا ہوں

تمھیں یاد ہے وہ زمانہ جب صرف فارسی کی غزلیں لکھنے کا دورہ مجھ پر پڑا تھا، اُس وقت تو میں نے ظاہر نہیں کیا تھا، لیکن اب کہتا ہوں کہ فارسی کی طرف میں نے صرف اسی لئے توجہ کی تھی کہ اپنی اُردو شاعری کی طرف سے میں مطمئن نہ تھا۔ آخر وہ دور بھی ختم ہو گیا۔ اور اب شاعری کے لحاظ سے میں اسی منزل میں ہوں جس کا ذکر میر نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ

القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

میرے مرنے کے بعد تمھیں اختیار ہے۔ اپنی زندگی میں کبھی اس کی اجازت نہ دوں گا

کرمفرمائے بندہ

گرامی نامہ جس کو پند نامۂ فرید الدین عطار کہنا زیادہ موزوں ہے، ملا۔ آپ نے جس محبت و خلوص کے ساتھ مجھے امر خاص سے باز رکھنے کا مشورہ دیا ہے، اس کا شکریہ نہ ادا کرنا ظلم ہے، لیکن معاف فرمائیے۔ آپ کا یہ خیال کہ تنہا میں اس کا ذمہ دار ہوں درست نہیں

در خراباتم نہ بد مستی خراب
بادہ پنداری کہ تنہا می زنم

میں تو اس کوچہ میں اس وقت تک قدم نہیں رکھتا، جب تک مولانا اور ان کے برادر زادہ ارجمند میرے لئے خضر و الیاس کا کام نہ دیں، پھر یہ آپ مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں، اُن سے باز پرس کیجئے، ان سے دریافت فرمائیے کہ اصل معاملہ کیا ہے

حضرت، یہ آپ کہ کیا رہے ہیں، کس خیال میں ہیں۔ یہ سوء ظن اور میرے متعلق! آہ۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
شاید کہ تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

آپ کو معلوم نہیں کہ جس طرح ہر صدی میں ایک مجدد پیدا ہوا کرتا ہے، اسی طرح ہر سو سال کے بعد ایک رند پیدا ہوتا ہے، سو اس کا حال تو آپ کو معلوم ہوگا، اور ممکن ہے کہ وہ آپ ہی ہوں۔ لیکن اس صدی کے رند کی بابت مجھ سے پوچھئے کہ کون ہے؟ ہر چند خود ستائی ہوگی لیکن آپ اصرار کریں گے تو صاف صاف کہنا ہی پڑے گا ——

پھر آپ ہی غور فرمائیے کہ آپ کا یہ تمام "دفتر تدبیر و مصلحت" کیا کام دے سکتا ہے اور آپ کی نجدانہ ترشیاں اس نشہ کو کیا اتار سکتی ہیں، جہاں اگر کبھی ترکِ معصیت کا خیال بھی ذہن میں آگیا تو اس کا کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے

نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نبود

نمازیں پڑھتے رہیئے، اور فرشتے بنے رہیئے۔ ہم لوگوں کو چھیڑنے سے فائدہ کہ اگر آزادی سے ایک سانس بھی آپ کے سامنے لیں تو بادہ دوشینہ کی بو سے آپ کو بھاگتے راہ نہ ملے گی —— ہم لوگ رند ہیں رند! سنا آپ نے؟

کیا پوچھتے ہو کس عالم میں وہاں سے واپس آیا۔ تم سے میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مجھے وہاں نہ بھیجئے تو ہو، لیکن اگر میں وہاں ہلاک ہو گیا تو کیا کروگے۔ تم نے کہا "نہیں اس کا ذمہ دار میں ہوں" سو آؤ، اب اپنی ذمہ داری کو پورا کرو، کیونکہ جس بات کا اندیشہ تھا وہ ہو کر ہی رہی یعنی انھوں نے مجھے خوب تباہ کیا

مجھ میں ہمت کہاں کہ زبان ہلاؤں، خدا کے لئے تمہیں میری طرف سے شکریہ ادا کردو۔ اور لکھدو کہ جب تک زندہ ہوں کبھی اس طرف کا رخ بھی نہ کروں گا

یہ جانتے ہوئے کہ میں اس باب میں کس قدر خود سر و آزاد ہوں، تم نے ان لوگوں میں بھیجا جو میری سانس کو بھی آزاد نہیں دیکھ سکتے تھے۔ مہمان نوازی اور خاطر و مدارات کی بھی ایک حد ہوتی ہے نہ یہ کہ انسان کو خود اپنے آپ سے شرم آنے لگے، اچھا کیا تم نے جلد واپس بلا لیا ورنہ میں تو عزم کر چکا تھا کہ اس ہفتہ سنکھیا کھا کر جان دیدوں گا۔ اور وصیت کر جاؤں گا کہ خبردار جو کسی نے میری لاش کو ہاتھ لگایا ہو، سڑک پر ڈال کر سگان بازاری کے سپرد کردی جائے، کیونکہ ان سے انتقام کی صورت اگر کوئی تھی تو صرف یہی۔ حقیقت یہ ہے کہ عجیب لوگ ہیں اور تم ان سے زیادہ عجیب ہو کہ جانتے ہوئے بھی مجھے آگاہ نہ کیا، ورنہ یہاں سے طیار ہو کر جاتا، اور کچھ نہیں تو کم از کم "ستیاگرہ" تو کر سکتا

[illegible]

یہ کون رقیب تھا جو کل صبح تمہاری محفل میں مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ وہی گورے گورے خوبصورت سے نوجوان، آنکھوں میں سرمہ، اور منہ میں پان! تم نے تعارف کرایا نہیں۔ میں نے تو جسارت کی نہیں یہ وہی صاحب تو نہیں ہیں جن کا ذکر تم نے نسیم میاں سے کیا تھا۔ کہ نہایت اچھے شاعر، بڑے ماہر طبیب اور زبردست اہل دل صوفی ہیں، گاتے بھی خوب ہیں اور محفل میں حال بھی نہایت دلچسپ لاتے ہیں

یہ تم نے کیا غضب کیا کہ مجھ سے ملوایا تک نہیں۔ میں ایسے سوانگ بھرنے والوں کا لاکھ مخالف سہی، لیکن تمہارے مہمان تو ہیں، شعر سنکر داد دیتا، نبض دکھا کر نسخہ تجویز کراتا، سامنے بیٹھ کر توجہ لیتا، گانا سنتا، محفل میں ان کے ساتھ رقص کرتا اور باور کرو جو شروع سے اخیر تک کسی ایک بات میں بھی تصنع ہوتا

صورت تو مجھے بھی اچھی معلوم ہوئی، سیرت کا حال ابھی تک معلوم نہیں۔ اگر کوئی حرج نہ ہو اور تمہارے مصالح اجازت دیں، تو کل شام کو انھیں غریب خانہ پر تکلیف دوں، اور قوالی کا انتظام کردوں، کھانا بھی یہیں کھالیں گے اور جن لوگوں کو بلانا مناسب ہوا۔ ان کی فہرست تمھیں مرتب کردو تو اچھا ہے

صدیقی العزیز

کل شام کو محبت نامہ ملا، مگر اس حال میں کہ پندرہ دن سے صاحب فراشس ہوں، اور کروٹ بھی دوسرے کے سہارے سے لیتا ہوں، افسوس ہے کہ میں اس وقت کسی خدمت کے قابل نہیں، آپ اگر دعا کے قابل ہیں تو اسے کر دیکھئے، دوا کی طرف سے تو میں مایوس ہو چکا ہوں

ایک عجیب قسم کا درد حوالی قلب سے اٹھ کر تمام رگ و پے میں دوڑ جاتا ہے۔ اور ۲۴ گھنٹے کے لئے بالکل بیکار کر جاتا ہے، اطبا کا خیال ہے کہ وجع القلب ہے، ڈاکٹر اس کو ریاحی درد بتاتے ہیں، بہرحال یہ تو ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں۔ اصل چیز کیا ہے، اس کی خبر کسی کو نہیں ——— کل سے خود اپنا علاج شروع کروں گا، وہی ہومیوپیتھی جس کے آپ مخالف ہیں۔ اور میں حد درجہ موافق۔ علامات کے لحاظ سے میں نے (Rhus Tox) تجویز کیا ہے، اور امید ہے کہ اس سے فائدہ ہو ——— آپ بھی یاد رکھئے، شاید یہ کبھی کام آئے

یہ خط میں ایک اور صاحب سے لکھوا رہا ہوں کیونکہ آپ جواب کے منتظر ہوں گے

نگار کے گزشتہ سالوں کے پرچے

حسب ذیل قیمت پر مع محصول مل سکتے ہیں

ستمبر سنہ۲۲ع	۴ر	جون سنہ۲۷ع	۴ر	جون سنہ۲۹ع	۸ر	اکتوبر سنہ۳۱	۳ر	ستمبر سنہ۳۲ع	۴ر
اکتوبر "	۴ر	اکتوبر "	۴ر	مارچ سنہ۳۰ع	۸ر	نومبر "	۳ر	اکتوبر "	۴ر
جنوری سنہ۲۳ع	۴ر	نومبر "	۴ر	مئی "	۴ر	دسمبر "	۳ر	نومبر "	۴ر
فروری "	۴ر	دسمبر "	عہ ر			جنوری سنہ۳۲ع	۱۲ر	دسمبر	۴ر
مارچ "	۴ر	مارچ سنہ۲۸ع	۴ر	ستمبر	۴ر	فروری "	۴ر	جنوری سنہ۳۳ع	عہ ر
اپریل	۴ر	اپریل "	۴ر	اکتوبر	۴ر	مارچ "	۴ر	فروری "	۸ر
مئی	۴ر	مئی "	۴ر	نومبر	۴ر	اپریل "	۸ر	مارچ "	۸ر
جون	۴ر	جون "	۴ر	دسمبر	۴ر	مئی "	۴ر	اپریل "	۸ر
اگست	۴ر	دسمبر سنہ۲۸ع	۴ر	جولائی سنہ۳۱ع	۳ر	جون "	۴ر	مئی "	۸ر
جنوری سنہ۲۶	۴ر	فروری سنہ۲۹	۴ر	اگست	۳ر	جولائی "	۴ر	جون "	۸ر
مئی "	۴ر	مارچ	۴ر	ستمبر	۴ر	اگست "	۴ر		

منیجر نگار لکھنؤ

ایک دُکھیاری لڑکی

بلا کی سردی پڑ رہی تھی، اور برف باری کا یہ عالم تھا کہ شاید آج کے بعد پھر کبھی ایسی دیکھنے میں نہ آئے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ سال کی آخری شام تھی، اُس سردی اور تاریکی میں ایک غریب چھوٹی بچی ننگے سر ابھی تک وہ مکان سے چلتے وقت سلیپر پہنے تھی، لیکن چونکہ وہ اس کی ماں کی تھیں، اس لئے ڈھیلی تھیں اور اس کے پاؤں سے جب وہ سڑک پر دو گاڑیوں سے بچنے کی کوشش میں تیز دوڑ رہی تھی، گر پڑی تھیں، ان میں سے یک کہیں غائب ہو گئی تھی دوسری ایک شریر لڑکا اٹھا کر بھاگ گیا تھا،

چھوٹی بچی ابھی تک چل رہی تھی، اس کے پاؤں سردی کی وجہ سے نیلے ہو رہے تھے، وہ اپنے بوسیدہ کرتے میں دیا سلائیوں کا ایک بکس لئے ہوئے تھی اور چند اس کے ہاتھ میں تھیں، صبح سے اس وقت تک کسی نے ایک دیا سلائی کی ڈبیہ بھی نہ خریدی تھی، اس بیچاری کو ایک پیسہ بھی نہ ملا تھا، بھوک اور سردی کی وجہ سے وہ کانپتی ہوئی چلی جا رہی تھی

برف کے گالے اس کے گھونگھر والے بالوں پر جو اس کے کندھوں تک آتے تھے، جمے جا رہے تھے، آخر کار تھک کر وہ دو مکانوں کی دیواروں کے ملنے سے جو ایک گوشہ نکل آتا ہے، وہیں بیٹھ گئی، اپنے پاؤں سمیٹ لئے اور انھیں گرم کرنے کی کوشش کرنے لگی، گھر جانے کی وہ ہمت نہ کر سکتی تھی، اس نے ابھی تک کوئی دیا سلائی نہ بیچی تھی، اس کو ایک پیسہ بھی نہ ملا تھا، اور بلا شبہ اس کا باپ اسے مارتا، اس کے علاوہ گھر میں بھی اتنی ہی سردی تھی جتنی کہ سڑک پر کیونکہ وہ کوٹھے پر رہتی تھی، اور ہر چند چھت کے بڑے بڑے سوراخ گھاس پھوس سے بند کر دئے گئے تھے۔ لیکن پھر بھی سرد ہوا سنسناتی ہوئی اندر آتی تھی، اس کے ہاتھ ٹھٹھر گئے تھے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دیا سلائی کی ایک تیلی نکالی، اور قریب کی دیوار سے رگڑی اُس سے ایسی صاف اور گرم روشنی پیدا ہوئی جیسی کوئی چھوٹی شمع روشن ہو، اس نے اپنے ہاتھ لو پر رکھ دے، عجیب دلکش روشنی تھی، اس چھوٹی بچی

کو ایسا معلوم ہوا۔ جیسے وہ ایک بڑے چولھے کے سامنے بیٹھی ہوئی ہے۔ دیا سلائی اتنی خوبصورتی سے جل رہی تھی کہ اس بچی نے اپنے پاؤں بھی گرم کرنے کے لئے پھیلاؤ ہے ــــــــ مگر ایک لمحہ میں دیا سلائی بجھ گئی، وہ گرم چولھا غائب ہوگیا اور چھوٹی بچی اپنے ہاتھ میں دیا سلائی کی جلی ہوئی تیلی لئے ہوئے جہاں بیٹھی تھی وہیں بیٹھی رہی

اس نے دوسری تیلی جلائی، اور پھر روشنی ہوئی جہاں کہیں اس کی روشنی پڑتی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ دیوار کا پردہ اٹھ گیا ہے، اور وہ کمرہ کے اندر دیکھ سکتی ہے، اس نے دیکھا کہ کمرہ میں ایک میز رکھی ہوئی ہے، اس پر ایک سفید میز پوش پڑا ہے اور اس پر چینی کی قابیں سجی ہوئی ہیں، سیب، اور سوکھے پھل بہت اہتمام کے ساتھ میز کے ایک طرف رکھے ہیں۔ اور ایک قاب میں بھنی ہوئی مرغی سے دھواں نکل رہا ہے، سب سے زیادہ دلفریب منظر یہ تھا کہ "مرغ مسلم" جس کے پیٹ میں چھری اور کانٹے لگے ہوئے تھے۔ قاب سے اچک کر سیدھا اس کے پاس چلا آیا۔ مگر شعلہ بجھ گیا۔ اور موٹی سخت دیوار پھر اس کے سامنے آگئی

اس نے تیسری دیا سلائی جلائی، شعلہ پھر پیدا ہوا، اور اس مرتبہ وہ ایک بہت خوبصورت کرسمس کے درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی تھی، یہ اس درخت سے جس کو اس نے گذشتہ کرسمس کی شام کو ایک امیر سوداگر کے گھر میں کھڑکی کے شیشوں سے جھانک کر دیکھا تھا، کہیں زیادہ بڑا اور کہیں زیادہ سجا ہوا تھا، ہزاروں شمعیں جل رہی تھیں، اور چھوٹی چھوٹی تصویریں جیسی اس نے دوکانوں میں دیکھی تھیں، درخت پر سے جھانکتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ لڑکی نے اپنے ہاتھ ان کی طرف پھیلا دئیے، اور دیا سلائی بجھ گئی، کرسمس کی شمعیں اونچی ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ وہ آسمان پر ستاروں کی مانند جھلملاتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں ان میں سے ایک گر پڑی اور اسکے پیچھے روشنی آسمان پر دور تک تیر شہاب کی طرح جاتی ہوئی معلوم ہوئی

اب کسی کی روح پرواز کر رہی ہے" چھوٹی لڑکی نے آہستہ سے کہا، یہ خیال اسے اپنی دادی کی وجہ سے پیدا ہوا۔ وہ دادی جس نے اس پر ہمیشہ شفقت و مہربانی کی۔ اور جو اب مر چکی تھی، اس نے کہا تھا کہ جب کوئی ستارہ ٹوٹتا ہے تو کوئی روح خدا کے حضور میں پرواز کرتی ہے۔ اس نے دوسری دیا سلائی جلائی، روشنی اس کے چاروں طرف پھیلی اور اس کی چمک میں اس نے اپنی دادی کو دیکھا جو اسی طرح نیک اور مہربان لیکن کہیں زیادہ مسرور نظر آتی تھی

اس نے کہا " دادی، مجھے اپنے پاس بلا لو۔ میں جانتی ہوں کہ تم مجھے دیا سلائی کے بجھتے ہی چھوڑ دوگی اور اسی طرح سے غائب ہو جاؤگی جیسے کہ گرم چولھا، سال نو کی دعوت اور کرسمس کا خوبصورت درخت" اس نے جلدی جلدی اپنی تمام دیا سلائیاں جلا ڈالیں کہ کہیں اس کی دادی چلی نہ جائیں۔ دیا سلائیاں اس آب و تاب سے جلیں کہ دوپہر کی روشنی ان کے سامنے ماند ہوگئی، اس سے قبل کبھی دادی اتنی لمبی اور شاندار نہ

اتنی خوبصورت اور مہربان نہ دکھائی دی تھیں۔ اس نے چھوٹی بچی کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور دونوں خوش خوش اڑتی چلی گئیں، وہ زمین سے دور اور بہت دور اڑ گئیں، یہاں تک کہ وہ اس جگہ پہونچ گئیں جہاں سردی، بھوک اور تمام تکلیفوں کا وجود نہیں

لوگوں نے صبح کو جب سردی پڑ رہی تھی چھوٹی بچی کو دیوار کے گوشہ میں دیکھا، اس کے گالوں پر چمک اور ہونٹھوں پر مسکراہٹ تھی، اور وہ سال کی آخری شب میں ٹھٹھر کر مر چکی تھی، نئے سال کا آفتاب اپنی نرم نرم کرنوں کے ساتھ اس پر چمک رہا تھا لیکن وہ سکون اور سکوت کی حالت میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے دامن میں دیا سلائیاں تھیں، ان میں سے ایک بنڈل پورا جل چکا تھا

"بیچاری اپنے آپ کو گرم کرنے کی کوشش کر رہی تھی" کچھ لوگوں نے اس کو دیکھ کر کہا، لیکن کسی کو اس کے خواب شیریں کا پتہ نہ چلا، اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ وہ اور اس کی دادی دونوں کیسے لطف کے ساتھ نئے سال کی خوشی منا رہی ہیں

(ماخوذ)

حسیب (نفیسی)

مذاکرات نیاز - یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے۔ ایک بار اس کو شروع کر دینا آخیر تک پڑھ لینا ہے اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں قیمت ۱۲ار (علاوہ محصول)

فلاسفۂ قدیم - اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں (۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روح کیساتھ (۲) مادئین کا مذہب (۳) حرکت کے کرشمے نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے قیمت عمر (علاوہ محصول)

فراست التحریر مکمل - یعنی اردو، انگریزی رسم الخط اور انداز تحریر دیکھ کر ایک شخص کی سیرت، چال چلن مستقبل اور تمام حالات معلوم کرنے کا فن - اردو میں بالکل پہلی کتاب قیمت ۸ر (علاوہ محصول)

تذکرۂ خندۂ گل - مولفہ عبدالباری آسی - جس میں ۳۰۰ صفحات سے زائد اردو و فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات مع ان کے لطائف و ظرایف و انتخابات کلام کے درج ہیں قیمت مع محصول عہ

مثنوی لالہ رخ - طامس مور کی معرکۃ الآرا مثنوی کا مکمل ترجمہ ادبی شاہکار کا بے مثل نمونہ قیمت مع محصول ۱۲ر

صحابیات - جسمیں عہد سعادت کی ۸۰ خواتین کے مستند حالات یکجا کر دیئے گئے ہیں ہر ۱۲ کا مقدمہ مولانا نیاز نے خاص اپنی انشا میں لکھا ہو اس کتاب میں سیر الصحابیات سے زیادہ صحابیات کے حالات درج ہیں قیمت علاوہ محصول عہ

منیجر نگار لکھنؤ

جمود

سائنس کی اصطلاح میں "جمود" (Inertia) مادہ کی وہ خاصیت ہے جو اُسے
خود بخود حرکت کرنے سے روکتی ہے یعنے اگر کوئی شے ساکن ہے تو، جب تک ہم اُس کو کسی ذریعہ سے متحرک نہ کردیں، وہ
ساکن ہی رہے گی - مثلاً اگر آپ کی جیب میں گھڑی ہو تو وہ جیب ہی میں رہے گی - جب تک آپ اُس کو جیب سے
نکال کر کسی دوسری جگہ نہ رکھ دیں - کسی قسم کی گاڑی اس وقت تک نہیں چلے گی جب تک ہم اس میں گھوڑا
نہ جوت دیں یا انجن نہ لگا دیں - گھوڑا یا انجن اُس "**خارجی طاقت**" کا منبع ہے جو گاڑی کو متحرک کرتی ہے
غرض کسی ساکن شے کو متحرک کرنے کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ اُس پر کسی "**خارجی طاقت**" کا اثر ڈالا جائے اسی
طرح اگر کوئی شے کسی وجہ سے متحرک ہوگئی تو وہ قیامت تک نہ رُکے گی - جب تک خارجی طاقتیں اس کو روک
نہ دیں - یہ نظریہ تو آپ کو عجیب وغریب، بلکہ مہمل معلوم ہوگا - آپ کہیں گے کہ جب ہم کسی چیز کو متحرک کر دیتے
ہیں تو وہ تھوڑی دیر کے بعد خود ہی ساکن ہو جاتی ہے - مثلاً گیند کو اچھالتے ہیں تو وہ زمین پر گر جاتا ہے، اور
گولی کو زمین پر لڑھکا دیتے ہیں تو وہ بھی تھوڑے فاصلہ تک جانے کے بعد رُک جاتی ہے - تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ
جب ہم کسی شے کو متحرک کر دیں تو وہ کبھی رُکے ہی نہیں ؟

مگر آپ نے اس مسئلہ پر کافی غور نہیں کیا - گولی "**خود ہی**" نہیں رُکتی - گیند "**آپ ہی آپ**" زمین
پر نہیں گر جاتا - گیند کو زمین کی کشش ثقل اپنی طرف کھینچتی ہے - گولی ہوا کی مزاحمت اور سطح زمین کی رگڑ سے
رُک جاتی ہے - اگر کشش ثقل نہ ہوتی تو گیند زمین پر نہ گرتا - اور سیدھا اُڑتا ہوا نہیں معلوم کہاں چلا جاتا -
زمین کی سطح بالکل چکنی ہوتی اور ناہمواری کا نام ونشان بھی نہ رہتا تو گولی برابر چلتی رہتی اور نہ معلوم کہاں تک
چلی جاتی ــــ اگر سنگ مرمر کا ہموار فرش ہو اور اُس پر شیشے یا پتھر کی گولی لڑھکا دی جائے تو بہت دُور تک تیزی
سے چلی جاتی ہے - یہ عام تجربہ کی بات ہے کہ جس قدر سطح ناہموار ہوگی اسی قدر جلد گولی رُک جائے گی - سطح زمین کی
"ناہمواری" ایک "**طاقت**" ہے، جو گولی کی رفتار کو سست کر کے بالآخر اُسے ساکن کر دیتی ہے - اس لئے،

کسی خارجی طاقت کا دباؤ ڈالے بغیر، نہ کوئی متحرک شے رُک سکے گی اور نہ کوئی ساکن شے متحرک ہو سکے گی - یہ ہے "جمود" کا علمی (Scientific) مفہوم

"جمود" کا یہ نظریہ سر اسحٰق نیوٹن نے پیش کیا تھا - اُس نے "حرکت" کے متعلق تین قوانین بیان کئے تھے - اِن میں سے پہلا قانون 'جمود' کی تعریف میں ہے - دوسرے قانون میں "طاقت" کو ناپنے کا معیار قائم کیا گیا ہے - اس مضمون میں، میرا مقصد پہلے قانون کی تشریح کرنا ہے

"جمود" کے مندرجہ بالا مفہوم پر غور کرنے سے واضح ہوگا کہ اس کا تعلق اشیا کے "وزن" سے کچھ نہ کچھ ضرور ہے - وزنی اشیا کو متحرک کرنے کے لئے زیادہ طاقت کی ضرورت ہوتی ہے - مٹی کے چھوٹے سے ڈھیلے کو ہم آسانی سے اٹھا کر بہت دُور پھینک دے سکتے ہیں - لیکن اگر اسی مٹی کی بہت بڑی چٹان ہو تو شاید دو بائیں آدمیوں کی طاقت بھی اُس کو اپنی جگہ سے ہٹا دینے میں کامیاب نہ ہو - جس شے کا جتنا وزن زیادہ ہے، اتنا ہی جمود بھی زیادہ ہے - ایک "جسیم ضخیم" شخص کا جمود، ایک پتلے دُبلے آدمی کے جمود سے بڑھ کر ہے --- موٹے آدمیوں کے "فطری تساہل" کا باعث ان کا وزن یا "حجم" ہے

نیوٹن کے خیال میں جمود مادہ کی ایک خاصیت ہے - مگر میرا خیال ہے کہ غیر مادی اشیا میں بھی جمود ہے - مثلاً شاعروں اور مصنفوں کو خیالات کا جمود ہوا کرتا ہے - جب تک اُن کے جذبات کسی وجہ سے نہ اُبھر آئیں وہ کچھ کہتے یا لکھتے نہیں - پھر اگر کسی شاعر کے جذبات میں ذرا سی بھی جنبش ہوئی تو وہ مسلسل "بکتا" رہتا ہے جب تک کوئی خارجی اثر اس کے جذبات کو درہم برہم نہ کردے

"طاقت" اور "جمود" میں گہرا تعلق ہے - "طاقت" عموماً "جمود" کی دشمن ہوتی ہے - ان دونوں کے باہمی ربط کے رازِ سربستہ کو علمِ ریاضی کی زبان میں محض چند حروف اور ہندسوں کے ذریعہ بیان کیا جا سکتا ہے - اس موضوع پر بحث کرنے کے قبل جمود اور وزن کے تعلق کو واضح کر دینا بہتر ہوگا - جمود کے دو پہلو ہیں متحرک اشیا کا جمود اور ساکن اشیا کا جمود - یہ تو ہم سمجھتے ہیں کہ متحرک شے کو روکنے کے لئے طاقت کی ضرورت ہے - اگر متحرک شے کی رفتار تیز ہے تو زیادہ طاقت درکار ہوگی - اس لئے متحرک اشیا کا جمود ان کی رفتار پر بھی منحصر ہے - کسی متحرک شے کے وزن اور رفتار کو ضرب دینے سے جو عدد حاصل ہوتا ہے اُس کو اُس شے کا "معیارِ حرکت" و Momentum کہتے ہیں

اگر وزن کے لئے "و" لکھیں، اور رفتار کے لئے "ر" تو معیارِ حرکت = ر × و

یعنے انگریزی میں یوں سمجھئے کہ

Momentum = M × V, (Mass × Velocity)

اُب سے "معیارِ حرکت" کا اصطلاحی نام "رَو" ہوگا۔ اس اختصار سے بڑی سہولت ہوگی۔
اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس متحرک شے کا "رَو" زیادہ ہے اس کا جمود بھی زیادہ ہے۔ ساکن اشیاء میں "رَو" نہیں ہے۔ لیکن ساکن اشیا کو حرکت میں لانے کے لئے اُن میں "رَو" پیدا کرنے کی ضرورت ہے "و" یعنے وزن تو ہر شے کا کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ جب ہم کسی ساکن شے کو مقررہ رفتار "ر" سے متحرک کر دیں تو اس نے "رَو" حاصل کرلیا۔ اب اُس کو ساکن کرنے کے لئے، مخصوص "مقدار" میں "طاقت" کی ضرورت ہوگی جو "رَو" کے اثر کو بالکل زائل کردے یعنے "ر" کو صفر بنادے
"رَو" اور "طاقت" کے تعلقات پر آئندہ اظہار خیال کروں گا

آرزو (جیلی)

آئندہ جنوری ۱۹۳۵ء کا نگار

تنقید و تحقیق کا ایک بے بہا سرمایہ ہوگا

لکھنؤ اور دہلی اسکول کی شاعری پر مکمل بحث مُلک کے بہترین اہلِ قلم کی کاوشوں کا مجموعہ، اس موضوع پر بالکل آخری لفظ ـــــ ضخامت خدا جانے کتنی ہوجائے ـــــ

نگار کی خریداری جاری رکھیے

تاکہ یہ مجموعہ آپ کو مفت مل جائے ـــــ

منیجر نگار لکھنؤ

بیراگ کا بروگ

(مسلسل)

(۵)

اس میں شک نہیں کہ کملا کی رگوں میں ایک پشت نہیں سیکڑوں پشت سے راجپوت خون دوڑ رہا تھا جو حکومت و فرمانروائی کے لئے مخصوص ہے، اور خود اس کی اتنی عمر اسی احساس میں بسر ہوئی تھی کہ راجکماریوں کی زبان سے جو لفظ نکلے وہ پورا ہونے کے لئے ہے اور جو تمنا ان کے دل میں پیدا ہو، اس کا کامیاب ہونا ضروری ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ کملا کی حقیقی مسرت کبھی اس ساعت سے وابستہ نہ ہوتی، جب وہ تعمیل حکم میں لوگوں کو سرنگوں دیکھتی تھی، بلکہ وہ اس وقت خوش ہوتی تھی۔ جب اس کا فرمان سنکر کبھی کوئی اتنا ہی کہہ دیتا کہ "کیا راجکماری ابھی؟"

وہ فطرت کی طرف سے ایک ایسا وسیع دماغ لائی تھی جس کے سامنے اس کو ساری دنیا کی بساط مملکت بھی تنگ نظر آتی تھی چہ جائیکہ رتن گڈھ کی سرزمین جو چند ہزار مربع میل سے زیادہ نہ تھی وہ کہا کرتی تھی۔ اور کبھی کیا تھی، دل میں سوچا کرتی تھی کہ کسی راجہ کے یہاں پیدا ہونا گویا قفس کے اندر پیدا ہونا ہے اور قفس خواہ لوہے کا ہو یا سونے کی تیلیوں کا بہرحال قفس ہے

اس کی طبیعت بہت آزاد واقع ہوئی تھی اور ہر چیز کا مطالعہ وہ بہت قریب سے کرنا چاہتی تھی اس لئے وہ گھبرا اٹھتی جب اوسے معلوم ہوتا کہ راجہ کے یہاں پیدا ہونا۔ گویا ہر اس چیز سے دور رہنا ہے جسے تمام انسانوں کے لئے قدرت کی نوازش عام کہتے ہیں

وہ سوچا کرتی کہ انسان کے لئے بقاء حیات کے لئے جو شرائط ضروری ہیں وہ راجہ اور پرجا دونوں کے لئے یکساں ہیں، پھر ان دونوں میں تفاوت کیسا، فرق مراتب کیوں کیا اس لئے کہ ایک کا دماغ دوسرے سے زیادہ

ترقی یافتہ ہے، مگر اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جو حکمران ہے وہ سب سے زیادہ احمق وجاہل ہے، تو کیا اس لئے کہ ایک دوسرے سے زیادہ بہادر وجری ہے، لیکن کیا حکومتوں کا قیام اس تلوار پر منحصر ہے جو بادشاہ کے پہلو میں نظر آتی ہے یا اُس تلوار پر جو ایک معمولی سپاہی کے کمر میں لٹک رہی ہے ——— ظاہر ہے کہ یہ امتیاز صرف اتفاقات کا نتیجہ ہے جسے خود انسان کی گمراہیوں نے پیدا کیا ہے اور جو فطرت کے نزدیک کبھی پسندیدہ نہیں ہو سکتا۔

وہ چاندنی راتوں میں چاند کو دیکھتی۔ اور بیتاب ہو جاتی کہ کاش وہ پھولوں کی سیج کے بجائے کسی ساحل کے ریگزار پر ہوتی اور وہاں سے اس منظر کا لطف اٹھاتی، جب آفتاب اس کے قصر کے مرمریں ایوانوں پر طلوع کرتا تو وہ سوچا کرتی کہ معلوم نہیں جنگل کے چشموں اور پہاڑ کی آبشاروں پر اس کا طلوع کس طرح ہوتا ہوگا

برسات کی کسی رات میں اگر کبھی دُور سے بانسری کی آواز اوس کے کانوں میں آجاتی تو صبح کو دربار کے مغنیوں کا گانا اسے اچھا نہ معلوم ہوتا، اور اگر کبھی دھان کے کھیتوں میں وہ گاؤں کی عورتوں کو گاتے ہوئے سُن لیتی تو بے اختیار اس کا جی چاہنے لگتا کہ وہ بھی اُن کے ساتھ جاکر جذبات سے بھرے ہوئے سادہ گانے میں ان کا ساتھ دے ——— الغرض لملا نسل اور خاندان کے لحاظ سے چاہے کچھ ہو، لیکن اپنی طبیعت اور فطرت کے لحاظ سے وہ راجہ کی بیٹی نہ تھی بلکہ اس کسان کی بیٹی تھی جو دوسروں کا دُکھ برداشت کرنے اور اپنا دُکھ کسی سے نہ کہنے کے لئے پیدا ہوئی ہے ——— وہ محلوں کی فضا سے بسا اوقات اتنا گھبرا جاتی کہ شکار یا تفریح کے بہانے سے باہر جنگل کی طرف چلی جاتی اور وہاں چھپ کر بہ تبدیل لباس گاؤں کی لڑکیوں سے ملتی، اُن کے گھروں میں جاکر زمین پر بیٹھ جاتی اور اُن کی باتیں گھنٹوں سنا کرتی، وہ رنواس کی اس گفتگو سے جس کا تعلق زر وجواہر اور آرائش و زیبائش کے علاوہ کسی چیز سے نہ ہوتا، گھبرا اُٹھتی تھی اور جب گاؤں میں وہ صرف کھیتی یا مویشیوں کی باتیں سنتی تو ایسا محسوس کرتی کہ اس کا دل کھنچا جا رہا ہے، اور دنیا میں پہلی بار اس نے قدم رکھا ہے

مذہبی معتقدات کے لحاظ سے وہ سخت ہندو تھی اور پوجا کے تمام مراسم نہایت پابندی سے ادا کیا کرتی تھی، لیکن محل کے مندر میں وہ پوجا کرنے سے بھی خوش نہ ہوتی تھی، کیونکہ وہاں کی ہر چیز اسے سونے چاندی میں لپٹی ہوئی نظر آتی تھی اور راجکماری ہونے کا احساس اس وقت بھی اس سے علیحدہ نہ ہوتا تھا، اسی لئے وہ اکثر و بیشتر بلدا دیجی کے مندر چلی جاتی۔ کیونکہ وہاں پہونچنے کے بعد جب وہ عام انسانوں کے برابر کھڑی ہو کر پھول چڑھاتی تو اس کا ضمیر ایک حد تک مطمئن ہو جاتا۔ اور دل کی گہرائی میں بہت کمی محسوس کرتی

لیکن چونکہ مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کو مغربی علوم وفنون بھی سکھائے گئے تھے، اس لئے وہ رسماً تو پوجا پاٹ سب کچھ کر لیتی تھی، لیکن اس کا دل ہمیشہ اس فلسفہ کی جستجو میں رہتا تھا جس کے ماتحت مذاہب کے اصول وضع کئے گئے ہیں۔ وہ سمجھتی تھی کہ کسی پتھر کے ٹکڑے کے سامنے خواہ وہ کتنا ہی حسین کیوں نہ تراشا گیا ہو۔ جھک جانا

کوئی معنی نہیں رکھتا، کسی مورتی پر پھول چڑھانا یا پانی ٹیکانا۔ بالکل لایعنی حرکت ہے، اگر کوئی خاص کیفیت اس سے پیدا نہ ہو اور چونکہ کیفیت کا تعلق خود انسان کی ذات سے ہے اس لئے وہ پوجا کے مفہوم کو بھی اپنے ہی اندر تلاش کیا کرتی تھی اور یہی وہ بات تھی کہ جب اوّل اوّل سوامی جی نے یہ کہا کہ "انسان خود پرمیشور ہے اور اس کو خود اپنی ہی پوجا کرنا چاہئے" تو وہ چونک پڑی اور ایسا محسوس کرنے لگی کہ ایک آواز جو بہت دُور سے اسے کم کم سنائی دیتی تھی دفعۃً بلند ہو کر اس کے دماغ میں گونجنے لگی ہے

کملا کی نسبت جگدیش پور کے راجہ سے ہو چکی تھی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ خود کملا کی مسرت یا نفرت اس سے بالکل وابستہ نہ تھی، یعنی جس وقت یہ بات پختہ ہوئی اور اس کو علم ہوا تو اس نے صرف اس لئے کہ باپ کی مرضی یہی ہے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اور خاموش ہو رہی، لیکن اس عمر میں شادی کے خیال سے جو خاص دلی انبساط پیدا ہوتا ہے، وہ اس میں پیدا نہیں ہوا اور اس نے سمجھ لیا کہ جس طرح صبح کو اٹھ کر نہانا یا منہ دھونا ضروری ہے اسی طرح غالباً یہ رسم بھی ضروری ہے

راجہ جگدیش پور، اپنے ہونے والے شوہر کو وہ کئی بار دیکھ بھی چکی تھی اور سوائے اس کے کہ وہ ایک خوبصورت نوجوان تو ضرور تھا، کوئی اور خاص بات اس میں نہ پائی جاتی تھی، تعلیم کے لحاظ سے وہ بہت معمولی حیثیت کا انسان تھا اور تربیت و سیرت کے اعتبار سے جو اطلاعات حاصل ہوئی تھیں وہ اس سے زیادہ نہ تھیں کہ اس کا اکثر وقت سیر و شکار میں صرف ہوتا ہے یا پھر ایسے مشاغل میں جو دنیا کو غور و تامل کے ساتھ دیکھنے میں کوئی مدد نہیں دے سکتے

کملا کے باپ کے لئے سب سے زیادہ مسرت اس رشتہ میں یہ تھی کہ دونوں ایک ہی خاندان کے راجپوت تھے۔ اور دوسرے یہ کہ جگدیش پور بڑی ریاست تھی اور وہاں کی مہارانی بننا کوئی معمولی بات نہ تھی

نسبت کے بعد کملا اور اس کے باپ کے درمیان اس معاملہ میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی اور اگر ایک طرف آہستہ آہستہ شادی کی طیاریاں ہو رہی تھیں تو دوسری طرف کملا جو اس طرف سے بالکل خالی الذہن تھی بدستور فلسفۂ زندگی پر غور کرنے میں منہمک تھی

سوامی جی سے ملنے کے بعد اوّل اوّل جو تغیر اس کے ذہن میں ہوا وہ صرف یہ تھا کہ پہلے جن باتوں سے وہ سرسری گزر جاتی تھی اب اُن پر غور کرنے لگی۔ لیکن رفتہ رفتہ جب یہ ملاقاتیں بڑھیں اور تبادلۂ خیال زیادہ وسیع ہوا تو اس کے خیالات میں ایسا غیر معمولی انقلاب پیدا ہوا کہ اس کے باپ کو بھی آخرکار اس کا علم ہو گیا اور اس نے کملا کو بُلا کر تصدیق کرنا چاہی

راجہ رنبیر سنگھ رتن گڈھ کا راجہ، ادھیڑ عمر کا انسان تھا اور اپنی وضع و قطع، عادت و خصلت کے لحاظ سے اسی زمانہ کا راجپوت تھا جب عزت کا معیار باپ دادا کی روایات اور پرانے نقوش سے ہٹنا سخت

گناہ سمجھا جاتا تھا - اس میں کلام نہیں کہ یوں وہ نہایت نیک نفس، اور خوش اخلاق تھا اور یہ بھی درست ہے کہ وہ کملا کے معاملہ میں بعض اوقات اپنے اعتقاد و یقین کے خلاف اُن حدود سے بھی تجاوز کر جاتا تھا جو اس کے آبا و اجداد نے قایم کئے تھے، لیکن ظاہر ہے کہ وہ یہ سب کچھ اسی حد تک کر سکتا تھا کہ اس کی عزت نفس گوارا کرے، لیکن جب سوال خاندانی وقار کا ہو تو ظاہر ہے کہ وہ کیونکر اسے برداشت کر سکتا تھا

رات اس کے اندر خاص محل کے درمیانی کمرے میں راجہ رنبیر سنگھ بیٹھا ہوا تھا کہ کملا آئی اور سلام کر کے سامنے مؤدب کھڑی ہو گئی - راجہ نے کچھ دیر تک اس کے سراپا کو غور سے دیکھا اور بولا کہ بیٹھ جاؤ ---- کملا وہیں گدے پر بیٹھ گئی اور بولی کہ " مہاراج آپ نے اس وقت خلافِ معمول کیوں یاد فرمایا ہے "

راجہ ---- "کملا، یہ آج تم نے ساری کیسی پہن رکھی ہے، کیا رتن گڑھ کے توشہ خانہ میں اب کوئی ساری ایسی نہیں رہی جسے راجکماری استعمال کر سکے "

کملا ---- " نہیں مہاراج، توشہ خانہ میں کیا کمی ہے، اور ہزاروں ساریاں راجکماری کے لائق موجود ہیں، لیکن کملا کے قابل کوئی نہیں "

راجہ ---- " تو کیا تم کملا نہیں ہو اور کملا راجکماری نہیں ہے "

کملا ---- " ہاں میرا نام کملا ہے اور میں ایک راجہ کی بیٹی بھی ہوں، لیکن مہاراج کیا راجہ اور انسان دو الگ الگ چیزیں ہیں "

راجہ ---- " ہرگز نہیں "

کملا ---- " پھر جب میں بھی انسان اور میرا باپ بھی انسان ہے تو کیا انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنا کوئی عیب ہے "

راجہ ---- " تو کیا انسانوں کی بیٹیاں قیمتی کپڑے استعمال نہیں کرتیں "

کملا ---- " ہاں کرتی ہیں مگر اس وقت جب وہ پہلے ہزار عورتوں کے کپڑے، اُن کے تن سے اُتروا لیتی ہیں "

راجہ ---- " یہ کیا، کپڑے کیونکر اُتروا لیتی ہیں "

کملا ---- " کچھ نہیں، مہاراج، جانے دیجئے، بات یہ ہے کہ میرا جی اب صرف موٹے جھوٹے کپڑوں ہی کو چاہتا ہے، ریشم اور سونا بہت پہن چکی، اب ان سے جی گھبرا گیا ہے، اس میں کسی کا کیا حرج ہے "

راجہ ---- " حرج ؟ حرج کیوں نہیں، لوگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے، اور جگدیش پور خبر پہونچ گئی تو وہ کیا خیال کریں گے، تو آخر بھکارن تو نہیں ہے، جو اس طرح بے وندگی ہوئی موٹے کپڑے

کی ساری استعمال کرے۔"

کملا ــــ "مہاراج، یہ اتفاق کی بات ہے کہ میں راجہ کے گھر میں پیدا ہو گئی، اگر کسی فقیر کے جھونپڑے میں پیدا ہوتی تو یہ کپڑے بھی میسر نہ آتے"

راجہ ــــ "ٹھیک ہے، اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ جب تم راجہ کے گھر میں پیدا ہوئی ہو تو راجکماریوں ہی کی طرح تم کو رہنا بھی چاہئے، اگر پرمیشور نے ہم کو دیا ہے تو اس کو برتنا بھی چاہئے"

کملا ــــ "مہاراج، پرمیشور کا ذکر آپ کیوں بیچ میں لاتے ہیں، وہ کیوں کسی کو دینے لگا، اس کو کیا غرض کہ سو کو تباہ کر کے ایک کا گھر بھر دے وہ اگر تقسیم کرتا تو آج یا تو ساری دنیا دولتمند ہوتی یا سب کی سب مفلس و نادار"

راجہ ــــ "تو یہ دولت و عزت جو آج ہمیں حاصل ہے وہ پرمیشور کی دی ہوئی نہیں ہے"

کملا ــــ "ہرگز نہیں، بلکہ خود حاصل کی ہے اور اتنی بڑی قیمت دے کر حاصل کی ہے کہ مجھے تو سوائے خسارہ کے اور کچھ نظر نہیں آتا"

راجہ ــــ ہاں، بیشک قیمت دی ہے اور واقعی بڑی قیمت دی ہے لیکن خسارہ کیسا؟ اگر ہمارے باپ دادا نے اپنا خون بہا کر، یہ سب کچھ حاصل کیا تھا تو کیا آج ہم اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے ہیں اور اس میں خسارہ کی کون سی بات ہے"

کملا ــــ "مہاراج دنیا میں وہی خون قیمتی ہے جو دوسروں کے لئے بہایا جائے، لیکن اپنا خون اگر خود اپنے لئے بہایا گیا، تو ممکن ہے اس کی قیمت زر و جواہر، زمین و املاک کی صورت میں یہاں مل جائے لیکن پرمیشور کے نزدیک اس کی کوئی قیمت نہیں"

راجہ ــــ "تو کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں حکومت چھوڑ کر تمہارے سوامی جی کی طرح پہاڑ کی کھوہ میں بیٹھ جاؤں"

کملا ــــ "نہیں مہاراج، میں یہ نہیں کہتی، گو دنیا میں ایسا بھی ہوا ہے اور بڑے بڑے راجاؤں نے ایسا بھی کر دکھایا ہے، بلکہ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ جو زندگی میں بسر کر رہی ہوں اس سے تعرض نہ کیا جائے، کیونکہ میری راحت اسی میں ہے"

راجہ ــــ "میں نے اگر یہاں تم کو اس کی اجازت دے بھی دی تو کل جگدیس پور جا کر کیا ہوگا، کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ اس کو گوارہ کر لیں گے، یہاں تو خیر تم راجکماری ہو، مگر وہاں تو مہارانی ہو گی، راج کی عزت کا انحصار تمہاری ذات پر ہوگا، یہ کیونکر ممکن ہے کہ تم بھکارنوں کی طرح دربار میں

آؤ اور ان کی عزت خاک میں ملا دو"

کملا ــــــ "ہاں، مہاراج میں خود بھی یہی سوچ رہی ہوں کہ اس حال میں میرا وہاں جانا مناسب ہے یا نہیں اور ممکن ہے کوئی صورت ایسی پیدا ہو جائے کہ اس کی نوبت ہی نہ آئے"

راجہ رنبیر سنگھ جس کا غصہ اب ضبط سے باہر ہو چکا تھا، کھڑا ہو گیا اور چیخ اٹھا کہ "کملا تم میری محبت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤ، میں خوب سمجھتا ہوں کہ تمہارا دماغ کس نے خراب کیا ہے اور میں آج ہی رتن گڈھ کو اس کے وجود سے پاک کئے دیتا ہوں، جو تم کو بھی اپنا ہی ایسا خوار و ذلیل دیکھنا چاہتا ہے"

کملا بھی ساتھ ہی اٹھی لیکن قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتی، راجہ رنبیر سنگھ چلا گیا اور کملا بھی آنسوؤں کے چند قطرے فرش پر گرا کر پشت کے دروازہ سے نکل گئی

(باقی)

غالب کی شوخیاں اور شوخ نگاریاں :--

دنیا میں مشہور ہیں۔ لیکن اگر کوئی آپ سے کہے کہ اس کے حالات زندگی، اس کے کلام نظم و نثر، اس کی تصانیف اردو و فارسی سے یکجا کر کے سب کی سب کتابی صورت میں پیش کیجئے تو آپ کے لئے اس کا صرف ایک جواب ہوگا اور وہ یہ کہ

رسالۂ نگار بابت ماہ جنوری ۳۲ء

اٹھا کر دیکھئے جس کے ۱۶۰ صفحات اسی موضوع کے لئے وقف ہیں۔ اور پورا استقصا کر کے ان کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ پھر اگر یہ رسالہ آپ کے پاس نہیں ہے یا گم ہو گیا ہے، یا آپ کے کسی اور دوست کو ضرورت ہے یا اس کے بعد سے آپ نگار کے خریدار ہوئے ہیں۔ تو ۱۲؍ کے ٹکٹ بھیجکر طلب کر لیجئے۔ صرف چند کاپیاں رہ گئی ہیں۔ غالب کی عالم شباب کی سہ رنگی تصویر بھی اس میں شامل ہے

مینیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

مسیح کا دوبارہ زندہ ہونا

(جناب سید اصغر علی صاحب۔ ٹونک)

بعض تفاسیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کے مصلوب ہونے کے بعد ان کے دوبارہ زندہ ہونے کا عقیدہ مسلمانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ کیا آپ اس مسئلہ پر روشنی ڈال سکتے ہیں کہ اس کی کیا حقیقت ہے اور یہ عقیدہ مسلمانوں میں کہاں سے آیا

(نگار) ہر چند مسلمانوں کی مذہبی روایات میں علاوہ مسیحی و یہودی عنصر کے اور بھی دیگر عناصر اسقدر شامل ہیں کہ اگر کوئی شخص اُن کے نکالنے کی کوشش کرے تو اسلام میں "لا الٰہ الا اللہ" بھی باقی نہیں رہ جاتا کیونکہ توحید کا خیال بھی کوئی نیا خیال نہ تھا اور ریگستان عرب میں رسول اللہ کے ظہور سے قبل خدائے واحد کی پرستش کا آوازہ کئی بار بلند ہو چکا تھا۔ یعنی ہر چند اسلام، مذہب کے باب میں کسی احداث یا ابداع کا مدعی نہ تھا اور مذاہب سابقہ کی تصدیق ہی اس کا مدعا تھا لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں ہو سکتے کہ ہر رطب و یابس جو اُن مذاہب میں پایا جاتا تھا وہ اسلام میں بھی لے لیا گیا۔ اور تمام وہ روایات جو یہودیوں، نصرانیوں، آتش پرستوں یا دیگر مسلک والوں میں پائی جاتی تھیں اُن پر ایمان لانا، اسلام کا ضروری جزو قرار پایا

یقیناً ایسا نہ ہونا چاہئے، لیکن ہوا یہی اور اب عام طور پر اسلام جس معتقدات کا مجموعہ سمجھا جاتا ہے وہ بہت کچھ

خرافیات پر مشتمل ہے ـــــــ آپ کوئی مذہبی کتاب، کوئی تفسیر اٹھا لیجئے، آپ کسی مولوی سے جزئیات ایمان پر گفتگو کیجئے، کسی واعظ کا وعظ سنئے، آپ یہ معلوم کر کے حیران رہ جائیں گے کہ اسلام جس کے متعلق بالکل سادہ و فطری مذہب ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے، نہایت زبردست صنمیاتی لٹریچر اپنے اندر رکھتا ہے، جس پر ایمان لانا اس کے لئے اتنا ہی ضروری ہے، جتنا قرآن و رسول پر، کیونکہ یہ تمام باتیں احادیث سے مستنبط بتائی جاتی ہیں اور حدیث چونکہ فرمودۂ رسول ہے اس لئے اس کا ماننا فرض ہے خواہ عقل میں آئے یا نہ آئے اور خیر، یہ تو کوئی کہہ سکتا ہی نہیں کہ حدیث کا کیا اعتبار جبکہ ابوہریرہ اس کے راوی ہیں اور امام بخاری اس کو صحیح سمجھنے والے

الغرض مدعا یہ کہ موجودہ اسلام جو زیادہ تر جامعین احادیث اور اُن کے راویوں کا اسلام ہے، اتنا ہی عجیب و غریب ہے جتنا کوئی مذہب اس دنیا میں ہو سکتا ہے اور مشکل ہی سے کفر و اسلام کے درمیان کوئی خط امتیاز کھینچا جا سکتا ہے۔ مذاہب کا تقابلی مطالعہ نہایت دلچسپ چیز ہے، لیکن غالباً اس سے زیادہ دلچسپ موضوع یہ ہے کہ ایک مذہب نے معتقدات کا ماخذ اصلی کیا ہے۔ چنانچہ اس سے قبل ہم نے ایک مسلسل مضمون عہد عتیق کے ماخذ روایات کے متعلق شائع کیا تھا جو اہل علم کے طبقہ میں بہت پسند کیا گیا۔ یہ سلسلۂ استفسار جو مسئلہ آپ نے پیش کیا ہے وہ بھی اسی طرح پیروانِ محمدؐ و مسیح دونوں میں یکساں طور پر اہمیت رکھتا ہے، درانحالیکہ دونوں اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ وہ خالص بت پرستوں کی یادگار ہے

آپ کسی مولوی سے دریافت کیجئے کہ مسیح کے دوبارہ زندہ ہونے کے متعلق اسلام کی تعلیم کیا ہے تو وہ بلا تامل کہدے گا کہ اس پر ایمان لانا ہمارا فرض ہے کیونکہ رسول اللہ کی احادیث اس باب میں موجود ہیں۔ درانحالیکہ مسیح کا دوبارہ زندہ ہونا خواہ وہ مصلوب ہونے کے ساتویں دن مانا جائے یا قیامت کے قریب، اصنامی روایات قدیمہ سے لیا گیا ہے اور حقیقت سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں

مسیح کی وفات کو ۳۰۰ سال کا زمانہ گزر چکا ہے اور سلطنت روما نے ابھی تک عیسوی مذہب اختیار نہیں کیا ہے، ہر چند بعض شاہانِ روما اس نئے مذہب کی طرف اپنا میلان ظاہر کر چکے ہیں اور ایک دو کلیسا بھی تعمیر ہو چکے ہیں، لیکن شہر کی آبادی جو لاکھوں نفوس پر مشتمل ہے ہنوز اس نئے مذہب سے متنفر ہے اور نہ صرف عوام بلکہ وہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ اور اعیان و امراء کی جماعت بھی مذہب و عقائد مذہب کے لحاظ سے عہد تاریک کی باطل پرستیوں میں مبتلا ہے

ہاں، ۲۴ مارچ سنہ ۳۰۳ء کا ذکر ہے کہ روما میں موسم بہار کی مسرتیں شروع ہو گئی ہیں اور ۲۲ مارچ کو پوجاریوں کی جماعت ہاتھوں میں نرکل لئے ہوئے نکلتی ہے جو گویا اس امر کا اعلان ہے کہ سائبیلی دیوی کی پوجا کا مقدس ہفتہ

شروع ہوگیا ہے

اس کے پانچ دن بعد یہی پوجاری ایک بُت لئے ہوئے سڑکوں سے گزرتے ہیں اور مندر تک اُسے پہونچا دیتے ہیں یہ بُت ایک خوبصورت نوجوان دیوتا کا ہے جو ایک صنوبر کے درخت سے بندھا ہوتا ہے اور اس کے چہرہ پر موت کی زردی چھائی ہوتی ہے۔ یہ بت اٹیس دیوتا کا ہے اور یہ رسم گویا اس کے موت پر اظہار غم کے لئے اختیار کی جاتی ہے

اس کے بعد کا دن "خونیں دن" کہلاتا ہے، یعنی وہ دن جب اٹیس کا خون بہایا گیا تھا۔ اس کی یادگار میں پوجاریوں کو بھی خون آلود ہونا پڑتا تھا اور مشرق میں جہاں یہ رسم انتہائی جوش کے ساتھ ادا کی جاتی تھی۔ پوجاری اپنے عضو مخصوص کو کاٹ کر سائبل دیوی کی قربانگاہ پر نذر چڑھا دیا کرتے تھے، لیکن رومہ میں اس کی اجازت نہ تھی اس لئے وہ صرف اپنے جسم کو جا بجا زخمی کر لیا کرتے تھے تاکہ اٹیس کی موت کا غم ہر سال تازہ رہے۔

اس کے دوسرے دن اٹیس کے دوبارہ زندہ ہونے پر جشن منایا جاتا تھا اور یہ تقریب اتنی پُرمسرت ہوتی تھی کہ سارا رومہ گویا دیوانہ ہو جاتا تھا اور جو جس کے جی میں آتا تھا کر گزرتا تھا۔ دو دن بعد پوجاریوں کی جماعت ایک سیاہ پتھر کو جو فی الحقیقت لنگ تھا اور (جس کا بالائی حصّہ نقرئی ہوتا تھا) غسل دینے کے لئے ایک جگہ لیجاتے اور پھر وہاں سے باجے بجاتے ناچتے کودتے اور نہایت فحش گانے گاتے ہوئے واپس آتے

یہ بیان ہے اگسٹائن کا جو اس وقت تک عیسائی نہ ہوا تھا اور جس نے خود اپنی آنکھوں سے سنہ ۳۸۵ء میں اس رسم کو دیکھا تھا۔ اور تعجب کرتا تھا کہ عیسائیوں کے اس عقیدہ کو کہ مسیح مصلوب ہونے کے ساتویں دن پھر زندہ ہو کر آسمان سے زمین پر واپس آئے اہل رومہ کے اُن بُت پرستانہ مراسم سے کتنی مشابہت ہے۔ جس طرح اٹیس کو وہ صنوبر کے درخت سے بندھا ہوا دکھاتے ہیں اسی طرح عیسیٰ کو صلیب سے بندھا ہوا بتاتے ہیں اور جس طرح وہ دوبارہ زندہ ہوا تھا بالکل اسی طرح مسیح کی نسبت بھی بیان کرتے ہیں ——— یہ اگسٹائن وہی شخص ہے جس کے متعلق کبھی یہ خیال بھی نہ قائم ہو سکتا تھا کہ آئندہ چل کر سنٹ اگسٹائن کے مقدس نام سے تمام عیسوی دنیا میں مشہور ہونے والا ہے

سنٹ جروم جس کے بیان کی صداقت سے عیسوی دنیا کے کسی ہر فرد کو انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی لکھتا ہے کہ

"عہد بُت پرستی کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ زہرہ کا عاشق جو نہایت خوبصورت
نوجوان تھا، مار ڈالا گیا تھا اور پھر وہ جون میں دوبارہ زندہ ہوگیا تھا، چنانچہ
جون کا مہینہ بھی اسی کے نام سے موسوم ہے اور اس دیوتا کی مرگ و زیست
کی یادگار نہایت اہتمام سے ہر سال منائی جاتی ہے"

(حاشیہ صفحہ ۵۹) ۱؎ اہل رومہ کے صنمیات کی ایک دیوی جو تمام دیوتاؤں کی ماں سمجھی جاتی تھی۔

جروم جس نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ فلسطین میں بسر کیا تھا لکھتا ہے کہ یہ رسم تمام سرزمین عراق و فلسطین میں رائج تھی اور بالکل قدیم اہل روما کی خرافیاتی روایات کے مطابق تھی - فرق اگر تھا تو صرف اسقدر کہ وہاں اس کا نام ایسس تھا اور یہاں تموز، وہاں سائبل دیوی تھی اور یہاں استار - بالکل یہی روایت یونانیوں کے یہاں بھی پہونچی اور وہاں ان دونوں کا نام اڈونس اور وینس ہوگیا

الغرض عیسوی مذہب جہاں جہاں پہونچا کسی نہ کسی دیوتا کے مرگ و زیست کا فسانہ ہر جگہ پایا جاتا تھا اور اس کی یادگار ہر مقام پر نہایت اہتمام سے منائی جاتی تھی - سرزمین عراق میں اُر سے لے کر یروشلم تک، اس مر کر زندہ ہونے والے دیوتا کا نام تموز تھا - فلسطین کے شمال اور تمام ایشیائے کوچک میں اُسے ایسس کہتے تھے اور یونانیوں میں وہ اڈونس کے نام سے مشہور تھا ــــــ رہ گیا مصر سو وہاں بھی دریائے نیل کے ساحل پر ہر سال اوسیرس دیوتا کے ہلاک کئے جانے اور پھر اس کے دوبارہ زندہ ہونے کی تقریب پر میلہ لگا کرتا تھا، اور ایران میں عیسوی مذہب سے صدیوں قبل مذہب "متھرائیت" رائج تھا اور وہاں بھی متھرا کے مر کر زندہ ہونے پر ہر سال جشن منایا جاتا تھا

جس زمانہ میں عیسوی مذہب سرزمین یونان میں پھیلا، تمام مذاہب قدیمہ اور ان کے روایات اصنامی وہاں کثرت سے شایع تھے، اور تقریباً تمام مذاہب کے لوگ اپنی رسمیں آزادی سے ادا کرتے تھے - اس لئے ظاہر ہے کہ عیسوی مذہب کو بھی ان سے متاثر ہونا چاہئے تھا، چنانچہ وہ متاثر ہوا اور مسیح کے مصلوب ہو کر دوبارہ زندہ ہونے کی روایت انھوں نے بھی لے لی

رہ گئے اہل عرب، سو ان کے یہاں چونکہ نصرانی اور یہودی روایات پر اعتماد کرنے کا دستور چلا آرہا تھا، اس لئے اسلام لانے کے بعد بھی وہی کیفیت باقی رہی اور مسیح کے دوبارہ زندہ ہونے کا عقیدہ جوں کا توں انھوں نے بھی اختیار کر کے اس کی توثیق کے لئے احادیث وضع کر لیں

قرب قیامت کی علامت میں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ مسیح آسمان سے اُتر آئیں گے - اور مہدی آخرالزماں کا ظہور ہوگا، یہ عقیدہ بھی انھیں اصنامی روایات قدیمہ کی یادگار ہے اور کسی طرح اس کو خالص اسلامی چیز نہیں کہہ سکتے

قرآن مجید ان میں سے کسی بات کی تصدیق نہیں کرتا، اس لئے ایک مسلمان ان کے ماننے پر مجبور نہیں البتہ وہ لوگ جو احادیث کو قرآن سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں، یا جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ قرآن بغیر احادیث کی مدد کے سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا، ایسا کہتے ہیں تو کہنے دیجئے

ایک لفظ اور مصرع کی تحقیق

(جناب ز۔ بیگم صاحبہ حیرت۔ شملہ)

(۱) لفظ ناگزیر ہے یا ناگریز، اگر پہلی صورت درست ہے تو کیونکر

(۲) " از سقف خانہ تا بہ ثریا ازانِ تو " اس مصرعہ کے باقی اشعار کیا ہیں اور کس نے کہے ہیں

(نگار)

(۱) ناگزیر صحیح ہے اور ناگریز غلط فارسی میں گزیر کے معنی چارہ وعلاج کے ہیں اور ناگزیر "ضرورت" کا مفہوم ظاہر کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے

(۲) جس نظم کا یہ مصرعہ ہے وہ وحشی کی ہے۔ پوری نظم یہ ہے:۔

زیباتر آنچہ ماندہ زبابا ازانِ تو بد اے برادر از من و اعلیٰ ازانِ تو
ایں طاس خالی از من و آں کوزہ کہ بود پارینہ پُر ز شہد مصفا ازانِ تو
یابونے ریسمانِ گُسل، میخ کن ز من مہمیز کلہ تیز و مطلا ازانِ تو
آں دیگ لب شکستہ صابون پزی من آں چمچۂ ہریسہ وحلوا ازانِ تو
آں قوچ[1] شاخ کج کہ زند شاخ ازانِ من غوغائے جنگ قوچ وتماشا ازانِ تو
ایں اُشتر[2] چموش[3] لگد زن ازانِ من ایں گربۂ مصاحب بابا ازانِ تو
از صحن خانہ تا بہ لب بام ازانِ من وز بام خانہ تا بہ ثریا ازانِ تو

ایک نظم میلی نے بھی اسی زمین میں لکھی تھی، فرق یہ ہے کہ وحشی نے بھائی سے خطاب کیا ہے اور میلی کا

---

[1] قوچ، بکری کو کہتے ہیں [2] استر، خچر کو کہتے ہیں [3] چموش، شریر لات مارنے والے جانور کو کہتے ہیں

خطاب بہن سے ہے، لکھتا ہے :۔

ہمشیرہ، خرج ماتم بابا از آنِ من — صبر از من و ترددو غوغا از آنِ تو
در خفیہ استماع وصیت از آنِ من — در نوحہ ہمزبانیِ ماما از آنِ تو
کہنہ قلم دوات شکستہ از آنِ من — طومار نظم و دفتر انشا از آنِ تو
آں لاشہ اشترانِ قطاری از آنِ من — آں بارکش خرانِ توانا از آنِ تو
یک ہفتہ چرخ مطرب و ساقی از آنِ من — ہفتاد سالہ طاعت بابا از آنِ تو
آں مالہا کہ ماندہ بدنیا از آنِ من — واں چیزہا کہ کردہ بہ عقبیٰ از آنِ تو

رفیعی کاشانی نے بھی ایک نظم اسی مفہوم کی بہ تبدیل قافیہ لکھی تھی :۔

مال و منالِ حضرت بابا برادرا — یک نیمہ از تو نیمۂ دیگر از آنِ من
من آں نیم کہ گویم از یں جنسہا کہ ہست — جنسے کہ باشد از ہمہ بہتر از آنِ من
جان برادری تو، ز تو ہر چہ بہتر ست — بد ہست ہر چہ جانِ برادر از آنِ من
قرضِ پدر کہ از ہمہ بیش ست از آنِ تو — وجیش کہ ہست از ہمہ کمتر از آنِ من
آں چار باغ خرم مرہوں از آنِ تو — آں یک دو باغ کہنہ بیدر از آنِ من
آں مادیاں کہ داشت صد کرہ زانِ تو — آں اشترانِ بارکشِ نر از آنِ من

ان تینوں نظموں میں وحشی کی نظم سب سے بہتر ہے اور اسی لئے وہ مشہور ہو گئی

ضرورت ہے شوہر کی

ایک ۱۸ سال کی نوجوان، خوشرو، سلیقہ مند اور تعلیم یافتہ لڑکی کے لئے ـــــ معاش کی طرف سے اطمینان ہونا چاہئے، اور عمر ۳۰ سال سے زائد نہ ہو ـــــ یو۔ پی کے باشندہ کو ترجیح دی جائیگی ایڈیٹر صاحب نگار سے ہر طرح کا اطمینان کیا جاسکتا ہے کیونکہ وہ لڑکی اور اس کے خاندان سے بخوبی واقف ہیں ـــــ خط و کتابت اس پتہ سے کی جائے

ا۔ ن۔ ذریعہ منیجر نگار۔ لکھنؤ

بابُ المراسلۃ والمناظرہ

(جنابِ ہرنام سنگھ صاحب - کرگل کشمیر)

(۱) آپ مذہب اسلام کو فطری اور آخری مذہب فرماتے ہیں مگر میری سمجھ میں نہیں آتا آخر ویدوں کی تعلیم میں وہ کون سی کمی تھی جو اس آخری مذہب سے پوری ہوئی یا تو مجھے قرآن سمجھنے میں غلطی ہوگئی ہے یا میرے ہاتھ میں غلط ترجمے لگے ہیں - حوالہ دینے کی چنداں ضرورت نہیں ستیارتھ پرکاش جس کے مصنف سوامی دیانند ہیں آپ کی نظر سے ضرور گذری ہوگی

اسلام کے جو اصول آپ پیش کرتے ہیں واقعی قابلِ قدر ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ہر مذہب کے "لغویات" نظر انداز کردینے کے بعد وہی "جوہر لطیف" رہ جاتا ہے جسے آپ اسلام کہتے ہیں تو پھر فطری اور آخری مذہب میں کیا خوبی ہوئی کیا دوسرے مذاہب کے متعلق یہی نہیں کہا جاسکتا ؟

(۲) آپ اس بات کے قائل ہیں کہ موت انسان کی آخری حد ہے اس کے بعد مادہ اپنے مرکز میں تحلیل ہوجاتا ہے نیز دوزخ وجنت کو بھی آپ اسی عالم میں مانتے ہیں یعنی کہ "ہر نیک وبد فعل خود اپنی سزا و جزا ہے !" اگر میں نے اسے سمجھنے میں غلطی سے کام نہیں لیا تو اس کی مختصر تشریح یہی ہوسکتی ہے کہ نیک کام کرتے وقت یا کرنے کے بعد انسان کے دل کو خوشی وتسکین حاصل ہوتی ہے اور بد کام کرتے وقت یا کرنے کے بعد انسان کی جسمانی اور روحانی حالت میں خاص کمزوری پیدا ہوجاتی ہے اور اس کا ضمیر ہر وقت ملامت کرتا رہتا ہے

مگر اس دنیا میں ایسی ہستیاں بھی ہیں جن کا ضمیر بالکل مُردہ ہوچکا ہے وہ دوسروں کی دلآزاری سے اور ہر جائز وناجائز طریقہ سے اپنی خواہش پوری کرنے میں اپنی خوشی سمجھتے ہیں - اُن کے نزدیک انسانی جان کی چیونٹی سے زیادہ قدر نہیں وہ دوسروں کو اپنی خواہش پوری کرنے کے لئے قتل تک کردیتے

ہیں۔ عیش و عشرت سے زندگی بسر کر کے مرجاتے ہیں تو پھر آپ بتائیے کہ انھیں اپنے بد افعال کی سزا کب ملی؟ ان کا ضمیر مر چکا تھا۔ اُن کے دل کو انسان کی قدر کرنے کے بجائے دولت کی قدر کرنے میں تسکین ہوتی تھی یا خوشی ہوتی تھی۔ للہٰذا اس نے تمام عمر خوشی سے گذار دی۔ اور قانون کا ہاتھ بھی اُن تک نہ پہونچ سکا

خود میری حالت ہی سنئے جب کسی کار خیر کے لئے میں چندہ دیتا ہوں تو بعد میں میرا دل بہت "بے چین" ہو جایا کرتا ہے حالانکہ تقاضا یہ تھا کہ مجھے تسکین اور خوشی ہوتی

اگر اعتراض کیا جاوے کہ میرا مطمح نظر بجائے نیکی وہمدردی کے یہ ہے کہ دولت پیدا کرنا ہے تو میں عرض کروں گا کہ آخر نیکی وہمدردی کے زیر اثر کس نے اپنی تمام دولت لگادی؟

اگر واقعی ہمارا نقطۂ خیال، غلط ہے تو اس کا کیا علاج کہ ہمارے دلوں کو اپنی "غلطی" سے ہی تسکین ہوتی ہے اور اسی تسکین و خوشی کو آپ 'جزا' سے تعبیر کرتے ہیں پھر نیک وید میں کیا تفاوت

میں نے جو وید اور سیتارتھ پرکاش کا ذکر کیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ان کی تعلیم کو قرآن سے برتر سمجھتا ہوں بلکہ یہ محض مثال کے طور پر عرض کیا ہے ورنہ میں تو "نیاز کا مُرید" مشہور ہوں جس کا مطلب ہے بے دین، کافر، ملحد وغیرہ وغیرہ

(نگار) میرا اسلام کو فطری و آخری مذہب کہنا اس معنی میں نہیں ہے کہ میں دوسرے مذاہب کو بُرا کہتا ہوں بلکہ مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ وقت و زمانہ کے لحاظ سے اسلام کے اصول بہت وسیع ہیں اور اس میں کافی صلاحیت زمانہ کا ساتھ دینے کی ہے ——— دنیا میں جتنے مذاہب ہوئے ہیں وہ سب اپنے وقت و ماحول کے لحاظ سے بہتر و مناسب تھے۔ اس لئے یہ کہنا کہ فلاں مذہب فلاں سے بہتر ہے یا فلاں فلاں سے بدتر، درست نہیں البتہ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں تغیر ہو جانا ضروری ہے کیونکہ دنیا کا کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو ہمیشہ ہماری ضروریات کو پورا کرنے والا ہو۔ پھر اگر کوئی مذہب ایسا ہے جو اس تغیر کو قبول کرنے والا ہے تو ہم کہیں گے کہ اس میں زیادہ صلاحیت زمانہ کا ساتھ دینے کی ہے اور اگر کسی میں یہ اہلیت نہیں ہے تو دنیا خود اس کو تقویم پارینہ سمجھ کر پسِ پشت ڈال دے گی

ہندوستان میں جتنے مذاہب رُونما ہوئے وہ سب اپنے زمانہ کے لحاظ سے موزوں و مناسب تھے، اسی طرح ایران و مصر، و ایشیائے کوچک وغیرہ میں جتنے مذہب پیدا ہوئے سب اپنے اپنے عہد کے اعتبار سے ٹھیک تھے، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ وہ تھے سب زمانی و مکانی، یعنی ایک خاص زمانہ اور خاص سرزمین سے متعلق

تھے اور وہاں سے ہٹ کر وہ ساری دنیا پر حاوی نہ ہو سکتے تھے۔ برخلاف اسلام کے کہ وہ بیک وقت محدود بھی تھا اور غیر محدود بھی، یعنی اگر ایک طرف اس میں اہل عرب کو ابھارنے کی صلاحیت موجود تھی تو دوسری طرف ایسے اصول بھی اس میں پائے جاتے تھے جو ہر زمانہ اور ہر قوم کے لئے موزوں ہوں۔ اب یہ بات دوسری ہے کہ مولویوں نے اس رمز کو نہ سمجھا اور اُسے بھی اُسی رنگ میں پیش کیا جو دوسرے مُردہ مذاہب کا تھا

وہ اصول کیا ہیں اور میں کیوں اسلام کو فطری و آخری مذہب سمجھتا ہوں، اس کے متعلق بارہا اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہوں، مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ اسلام کو میں کسی خاص متعین مذہب کے اندر محدود نہیں کرتا، بلکہ اس کا مفہوم بہت بسیط لیتا ہوں جو صرف ترقی انسانیت کے مترادف ہے، یعنی اسلام نام ہے صرف ان اصول زندگی کا جو انسانیت کی ترقی کے ضامن ہیں اور جن میں تغیر ہوتے رہنا ضروری ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی وقت زمانہ کا اقتضاء یہ ہوگا کہ انسان خدا کا انکار کرنے کے بعد ہی ترقی کر سکے گا تو اسلام کا مدعا بھی یہی انکار ہوگا

یقیناً عام مذہبی لوگوں کے لئے یہ بات نہایت عجیب و غریب معلوم ہوگی، لیکن اگر میں اپنی کوتاہی عقل یا خرابی دماغ سے اسلام کا یہ مفہوم قرار دیتا ہوں تو کیا آپ یا کوئی اور اس کے لئے طیار ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے مذہب کو اس وسیع شئے کے ساتھ پیش کرے، پھر اگر ایسا نہیں ہے تو میرا یہ کہنا کہ اسلام ہی آخری و فطری مذہب ہے اور اس معنی میں وہ دیگر مذاہب سے بہت ممتاز نظر آتا ہے، کیونکر غلط ہو سکتا ہے

جزا و سزا کے متعلق جو خیال جناب نے ظاہر کیا ہے وہ نیا نہیں، تمام وہ مذاہب جو معاد کے قائل ہیں اور حیات بعد الموت کا یقین دلاتے ہیں، یہی دلیل پیش کرتے ہیں کہ دنیا میں اکثر ایسی مثالیں نظر آتی ہیں کہ باوجود انتہائی معصیت کے کوئی سزا یہاں نہ ملی اور ایک گناہگار نہایت مسرور زندگی بسر کر کے چلا گیا۔ پھر اگر یہ نہ مانا جائے کہ مرنے کے بعد جزا و سزا کا قصہ بھی لگا ہوا ہے تو اس کی کیا توجیہ ہو سکے گی اور دنیا میں نیکی و بدی کا امتیاز کیونکر قائم رہے گا

معاد کے لئے یہ دلیل پیش کرنا صرف اس عقیدہ کی بنا پر ہے کہ ہر کام کا نتیجہ ایک مخصوص اسلوب و نہج پر مترتب ہو، یعنی اگر کوئی شخص جرم کرتا ہے تو اس کو کسی نہ کسی طرح جسمانی یا روحانی سزا بھی ملنا چاہیئے یعنی جس طرح دنیاوی قانون کے ماتحت ایک مجرم کو قید و بند میں ڈال دیا جاتا ہے، اسی طرح خدائی قانون میں بھی ہونا چاہیئے، لیکن ایسا سمجھنا غلطی ہے، کیونکہ فطرت کبھی افراد کو نہیں دیکھتی بلکہ اجتماع کو دیکھتی ہے، یعنی اس کے جزا و سزا کا تعلق کسی مخصوص فرد یا ذات سے نہیں ہوتا، بلکہ ہیئت اجتماعی سے ہوا کرتا ہے

فرض کیجئے کہ ایک شخص نے اپنی ساری عمر جور و ستم میں بسر کر کے دولت فراہم کی اور دنیا میں نہایت مسرور زندگی بسر کر کے عمر طبیعی تک پہونچ کر مرا، لیکن فطرت کو اس سے غرض نہیں کہ وہ اس جرم کے عوض میں اس کو کوئی سزا دے، کیونکہ اپنے اس بُرے اخلاق سے جتنا نقصان وہ سوسائٹی یا ہیئت اجتماعی کو پہونچا گیا ہے وہ

کافی سزا اس سوسائٹی کی ہے جس کا وہ فرد تھا اور جس نے اس کے اس جور وستم و بد اخلاقی کو جائز رکھا

اس کی زیادہ روشن و واضح مثال میں ہندوستان کے کسی رئیس یا نواب کو لے لیجئے کہ وہ شب و روز اپنی رعایا کو لوٹ لوٹ کر دولت جمع کرتا ہے اور اپنی خواہش نفسانی پر سب کو قربان کر دیتا ہے، پھر اسی کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی تمام عمر اسی لطف و مسرت میں بسر کر دیتا ہے اور کوئی سزا اس کو یہاں نہیں ملتی۔ لیکن کیا آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ اس کی زندگی میں جن جن لوگوں کو تکلیفیں پہونچی ہیں کیا وہ ان لوگوں کے لئے کافی سزا نہ تھی، پھر سوال یہ ہے کہ کیا ایسے شخص کو رئیس بنائے رکھنا یا اس کے ہاتھ میں عنان حکومت دیدینا خود افراد قوم یا ہیئت اجتماعی کی غلطی نہیں ہے اور اس لئے اگر وہ اس کے مظالم کو برداشت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں تو یہ اُن کی سزا ہے جو انھیں بھگتنا چاہیئے۔ یقیناً اس ایک شخص نے جو یہ سب کچھ کر گیا یہاں کوئی سزا نہیں پائی، اور نہ میرے عقیدہ کے مطابق مرنے کے بعد اسے کوئی سزا ملتا ہے، لیکن چونکہ یہ بالکل انفرادی امر ہے اس لئے قابل لحاظ نہیں اگر خدا کو آپ قادر مطلق مانتے ہیں تو اس سے اس کی باز پرس ممکن نہیں اور اگر خدا کے قایل نہیں تو پھر یہ سوال بدرجۂ ادنیٰ اور بھی نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ نظام فطرت کے سامنے افراد نہیں ہوا کرتے بلکہ اُن کی اجتماعی حیثیت ہوا کرتی ہے

اگر ہماری جماعت میں کوئی شخص نااہل یا مجرمانہ ذہنیت کا پیدا ہو جاتا ہے اور ہم اس کے وجود کو بغیر کسی اصلاح کے گوارا کر رہے ہیں تو یقیناً ہم کو اس کی سزا ملنی چاہیئے اور وہ سزا یہی ہے کہ اس شخص کے بدعنوانیوں سے سوسائٹی کو کافی نقصان پہونچ جاتا ہے اور پھر ایک زمانہ تک اس کی تلافی نہیں ہو سکتی

انسان کو عقل و فہم صرف اس لئے عطا ہوئی ہے کہ وہ انفرادی اغراض سے علیحدہ ہو کر صرف اجتماعی مفاد کو پیش نظر رکھے اور اگر اس نے اپنی زندگی کا کوئی ایسا نظام مرتب نہیں کیا ہے تو یہ اس کی غلطی ہے اور اسی غلطی یا جرم کی یہ سزا ہے کہ وہ اپنے بعض افراد کے ہاتھ سے تباہ ہوتا رہتا ہے

ایک ظالم بادشاہ کا وجود قدرت کی سزا ہے جو رعایا کو اُن کے اس احساس غلامی پر دی جاتی ہے جس نے اُس بادشاہ کی سلطنت کو گوارا کیا۔ اور ایسی صورت میں یہ سوال اٹھانا کہ خود اس بادشاہ کو کیا سزا ملی بالکل یہی صورت رکھتا ہے کہ ہم آگ کے اس شعلہ کے متعلق جس نے ہمارے گھر کو پھونک دیا ہے۔ یہ پوچھیں کہ اسے قدرت کی طرف سے اس ظلم کی کیا سزا ملی

نوع انسانی کے اجتماعی زندگی کا اقتضاء یہ ہے کہ وہ اپنے افراد کو حد سے آگے نہ بڑھنے دے اور ان میں اس امر کا احساس پیدا کرے کہ وہ ہیئت اجتماعی ہی کے ایک عضو ہیں اور اگر آج ہم اس میں کامیاب ہو جائیں تو دنیا سے معصیت و جرم کا وجود مٹ جائے۔ لیکن چونکہ ہم ابھی تک اسی رمز کو نہیں سمجھ سکے ہیں اور نوع انسانی خود

تفریق و امتیاز کی لعنت میں گرفتار ہے اس لئے نااہل افراد بھی پیدا ہو رہے ہیں اور رہیں ان کے مظالم برداشت کرنا پڑیں گے۔ کیونکہ ان کا وجود خود ہمارے کردار کی سزا ہے

علاوہ اس کے موت کے بعد جزا و سزا کا خیال اصولی نقطۂ نظر سے بھی کوئی خاص وزن نہیں رکھتا ——— اگر آپ معاد کے قایل ہیں اور جزا و سزا کو سب اسی سے متعلق سمجھتے ہیں تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ خدا کا یہ نظام کوئی خاص مدعا رکھتا ہے اور وہ مدعا سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ بُرے کام کرنے والوں کو عبرت حاصل ہو اور اچھے کام کرنے کا شوق پیدا ہو۔ یعنی جس طرح اس دنیا میں ایک مجرم کو سزا اور دوسرے اچھا کام کرنے والے کو انعام دے کر ترہیب و تشویق کا سلسلہ جاری ہے، اسی طرح مرنے کے بعد بھی ہوگا، لیکن کیا کبھی آپ نے اس امر پر بھی غور کیا ہے کہ مرنے کے بعد انعام و سزا کا نتیجہ کیا ہے یعنی اگر اس دنیائے عمل میں لوٹ کر پھر واپس آنا نہیں ہے تو اس عقوبت و انعام کا اثر ہمارے اعمال و افعال پر کیا پڑ سکتا ہے۔ کتنا بڑا ظلم ہے کہ ایک شخص کو کسی جرم میں سزا دی جاتی ہے اور پھر اُسے کوئی موقع اس سے باز رہنے کا نہیں ملتا ——— اسی لئے تناسخ کا عقیدہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے، لیکن اس میں بھی خرابی ہے کہ کسی شخص کو سزا و انعام کا احساس نہیں ہوتا، یعنی فرض کیجئے کہ اعمال بد کی سزا میں ایک شخص مرنے کے بعد کتا ہو گیا، تو اس کتا ہونے کی حالت میں اسے یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ کسی وقت انسان تھا اور اپنے اعمال بد کی وجہ سے کتا ہو گیا ہے اسی کے ساتھ تلافی کا بھی موقعہ اس کو حاصل نہیں ہوتا اور جانور ہونے کے بعد وہ اپنے اعمال میں کوئی تغیر ایسا نہیں کر سکتا کہ پھر انسان ہو جائے۔ اس لئے سزا کی یہ نوعیت بھی بیکار ہے ——— الغرض معاد اور حیات بعد الموت کے سلسلہ میں انعام و سزا کی جو صورتیں بھی فرض کی جائیں۔ قابل قبول نہیں ہیں اور اس لئے مجبوراً یہی ماننا پڑتا ہے کہ جو کچھ ہے اسی دنیا میں ختم ہو جاتا ہے اور مرنے کے بعد بالکل وہی حالت انعدام طاری ہو جاتی ہے جو پیدا ہونے کے قبل تھی

اگر خدا واقعی ویسا ہی عظمت والا ہے جیسا کہ عام طور پر اہل مذاہب ظاہر کرتے ہیں تو پھر انسان کی حیات بعد الموت اور جزا و سزا کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ———

چیونٹیوں کی دنیا میں بھی ممکن ہے کہ یہی اعتقاد پایا جاتا ہو کہ جو قزاق چیونٹیاں ہیں۔ انھیں مرنے کے بعد سزا ملے گی، لیکن کیا ان کا یہ خیال صحیح ہے اور کیا جس وقت انسان انھیں پامال کرتا ہوا گزر جاتا ہے تو وہ اپنی حیات بعد الموت میں انسان کے خلاف فریادی ہو کر خدا سے انصاف طلب کرتی ہیں

اگر میں یہ کہوں کہ ہاں یہ سب صحیح ہے اور یقیناً چیونٹیوں کا بھی حشر و نشر ہوگا تو یقیناً آپ ہنس پڑیں گے۔ کیونکہ آپ کے مقابلہ میں چیونٹی جتنی غیر اہم مخلوق ہے کسی سے مخفی نہیں، لیکن کبھی آپ نے اس پر بھی

غور فرمایا ہے کہ خدا یا قدرت کے مقابلہ میں کیا انسان کی ہستی چیونٹی سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور اگر انسان اپنی جگہ حشر و نشر کا عقیدہ لئے بیٹھا ہے تو کیا فطرت کو اس پر ہنسی نہ آنی چاہیے

نیاز فتحپوری کے ادبی شاہکاروں کا نیا مجموعہ

جمالستان

(نگارستان کا دوسرا حصہ حجم ۵۰۰ صفحات)

قیمت فی کاپی مجلد للعہ، غیر مجلد للعہ، علاوہ محصول

خریداران نگار سے ایک روپیہ رعایت

فہرست مضامین حسب ذیل ہے

دنیا کا اولین بت ساز	فریب خیال	صدائے شکست	دو گھنٹے جہنم میں
ایک شاعر کی محبت	میر بیدانہ	تاریخ عرب کی ایک روایت جمیل	ایثار
شہید آزادی	بعد المشرقین	ولے بخیر گذشت	ٹیلی فون نمبر ۶۷۰
دو خط	جانعالم اور ملکہ مہر نگار	چند گھنٹے ایک مولوی کیساتھ	شبنمستان کا قطرۂ گوہریں
سودائے خام	درس محبت	ازدواج مکرر	انتظام علی صاحب
سنہ ۲۵ء کا ایک صوفی	ایک شاعر کا انجام	آدم و حوا سے پہلے	شہزادہ خرم اور بابیل
زہرہ کا ایک پجاری	رادھا	سرزمین دکن کی ایک دلنواز شام	نوجوان شہزادہ
مطربۂ فلک	چنگاری	محلہ کی رونق	داستان حسن و عشق کا ورق خونیں

دلگیر اکبر آبادی مرحوم

دلگیر مرحوم میرے اُن احباب میں سے تھے جن سے باوجود تعلق قطع ہو جانے کے تعلق باقی رہا —— یعنی باوصف اس کے کہ ایک زمانہ سے میں اُن سے بے خبر تھا اور وہ مجھ سے، لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ آگرہ وجوار آگرہ کا خیال آیا ہو اور دلگیر مرحوم سامنے نہ آگئے ہوں

اوّل اوّل میری اور ان کی شناسائی اب سے تقریباً ایک رُبع صدی قبل اس وقت ہوئی تھی جب انھوں نے اجرائِ نقاد کے سلسلہ میں، یو۔پی کے بعض شہروں کا دورہ کیا تھا اور سرا تھو سے لوٹتے ہوئے (جہاں اس وقت مہدی مرحوم تحصیلدار تھے) فتحپور میں قیام کیا تھا

ہر چند اس وقت میں بھی اُن کی طرح جوان تھا، لیکن میری جوانی صرف رعنائی خیال تک محدود تھی اور اُن کی، پرستاریِ جمال سے بھی آگے بڑھ جانا چاہتی تھی۔ —— اس لئے ان کا دو دن کا قیام، میرے لئے پُر لطف ہو یا نہ ہو لیکن ولولہ انگیز ضرور تھا اور غالباً یہ کہنا خلاف حقیقت نہ ہوگا کہ ادبیات کی طرف میری توجہ کے جو اسباب اوّل اوّل پیدا ہوئے، اُن میں ایک بڑا سبب دلگیر کی ذات بھی تھی —— پھر نقاد کو انھوں نے جس شان سے نکالا، اور جس انشا، کو وہ پیش کرنا چاہتے تھے: اس کے لکھنے والوں کو ڈھونڈھ نکالنے میں جس کاوش سے انھوں نے کام لیا، وہ حقیقتاً اُنھیں کا حصّہ تھا

دلگیر غالباً جناب، غوث الاعظم کی اولاد میں سے تھے۔ اور اسی لئے ان کے نام میں لفظ شاہ کا اضافہ پایا جاتا تھا۔ اور کچھ جائداد بھی بطور جاگیر اُن کے خاندان میں منتقل ہوتی چلی آرہی تھی —— مجھے یاد نہیں خود انھوں نے یا کسی اور نے مجھ سے ذکر کیا تھا۔ بہرحال یہ بات میرے دماغ میں محفوظ ہے کہ سال میں ایک بار غالباً عشرۂ محرم کے کسی تاریخ میں وہ اُس طلائی علم کو لوگوں کے زیارت کے لئے باہر نکالتے تھے جسے اُن کے مورث اعلےٰ جیلان سے ہندوستان لائے تھے۔ وہ اپنے نام کے ساتھ لفظ۔ سید بھی لکھتے تھے، درانحالیکہ خود جناب غوث الاعظم سید نہ تھے بلکہ شیخ تھے

اس سے مدعا یہ ہے کہ دلگیر کسب معاش کی طرف سے مطمئن تھے اور دنیاوی افکار کی وہ الجھنیں جو ہندوستان کے بہت سے ذہین دماغوں کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں کبھی ان کی راہ میں حایل نہیں ہوئیں، اور اسی لئے جب تک نقاد جاری رہا۔ خریداروں سے بے نیاز ہو کر جاری رہا اور اس کی اصلی شان کو دلگیر نے ہاتھ سے نہ جانے دیا

چونکہ دلگیر کا ذکر عین نقاد کا ذکر ہے اور اُن کی زندگی کا صرف وہی حصہ قابل التفات ہے جو نقاد کی خدمت میں صرف ہوا، اس لئے اُن کی دیگر ذاتی خصوصیات کو نظر انداز کرتے ہوئے، بار بار نقاد ہی کا نام زبان پر آتا ہے جس نے ان کو ملک سے روشناس کیا

نقاد پہلی بار کیوں بند ہوا، اس کا حال تو معلوم نہیں، لیکن دوبارہ جاری کس طرح ہوا، اس سے ملک کا ہر ادیب واقف ہے —— دہلی کی کوئی خاتون "قمر زمانی بیگم" دلگیر مرحوم کے ادبی خدمات کا اعتراف کرتی ہوئی ان کو دہلی طلب کرتی ہیں۔ یہ وہاں پہونچتے ہیں، رفتہ رفتہ مراسم بڑھتے ہیں اور آخرکار خود خاتون ادارت نقاد کی ذمہ داریاں اپنے سر لے لیتی ہیں —— ہائے، یہ بھی کیا زمانہ تھا، جب دلگیر ایک مجسمۂ کیف و رنگ تھے۔ اور ان کی ہر ہر سانس عشق و محبت میں ڈوبی ہوئی نکلتی تھی

برسات کا موسم ہے، بھوپال کے ذرہ ذرہ سے جوشش مستی اُبل رہا ہے، یادش بخیر ملک حبیب احمد صاحب کے مکان پر احباب کا قیام ہے اور دلگیر بھی موجود ہیں۔ کوئی کسی خیال میں ہو، لیکن دلگیر اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں —— ایک دن شام کو ہم سب حمیدیہ روڈ پر ٹہلتے ہوئے جا رہے تھے کہ دفعۃً شام کے دھندلکے اور سرد ہواؤں کے جھونکوں نے دلگیر کو بیتاب کر دیا اور وہ وہیں سڑک پر کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گئے، پوچھا گیا۔ شاہ صاحب خیر تو ہے۔ لیکن شاہ صاحب وہاں کہاں تھے۔ تھوڑی دیر بعد دفعۃً اپنی رانوں پر ہاتھ مار کر (اس زور سے کہ اگر وہ ہاتھ کسی انسان کے جسم پر پڑ جاتا تو سُرمہ ہو کر رہ جاتا) بولے کہ، سنو، اور سر دھنو، یہ کہکر انھوں نے قمر زمانی بیگم کا ایک مضمون جس کا عنوان شاید "کلی سے" تھا، اور جو حال ہی میں انھیں ملا تھا اور ابھی تک شایع نہ ہوا تھا، سُنانا شروع کیا، وہ انھیں زبانی یاد تھا —— اس میں شک نہیں کہ مضمون نہایت پاکیزہ تھا، لیکن اس کی معنوی خوبی کا علم اس وقت ہوا جب دلگیر نے کہا کہ "تم لوگوں کو معلوم ہے کہ کلی سے مُراد کیا ہے" اور پھر خود ہی بول اٹھے کہ "یہ کلی میں ہوں"

اس ایک واقعہ سے مدعا صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ نقاد کا دور ثانی خود دلگیر کے لئے کس درجہ نشہ آور تھا اور یہ ایک خاتون کی شرکت نے ان کو اور اُن کے رسالہ کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا تھا

افسوس ہے کہ نقاد کا یہ دور "دولت مستعجل" ثابت ہوا۔ اور ایک سال کے اندر ہی اندر عروج

و زوال کیا حیات و موت کی تمام منزلیں ختم ہوگئیں —— قمر زمانی بیگم کون تھیں، اور اتنا التفات غائبانہ صرف کرنے کرتے کیوں دفعتہً کنارہ کش ہوگئیں - یہ راز آج تک پبلک میں نہ آسکا، کیونکہ اس کے بعد جو خاموشی دلگیر نے اختیار کی وہ اخیر وقت تک دور نہ ہوئی اور ادبی دنیا سے وہ اس حد تک کنارہ کش ہوئے کہ آخر کار آنریری مجسٹریٹ بن گئے، اور اخیر دم تک یہی بنے رہے

دلگیر، خود بھی ایک خوشگو شاعر تھے اور انشاء عالیہ کو بہت پسند کرتے تھے، شعر ایک خاص جوش کے ساتھ پڑھتے تھے اور بے اختیار ہو جاتے تھے - مجھے خوب یاد ہے کہ ایک دن جب انھوں نے اپنا یہ شعر سنایا

یہ میکدہ کی بھیڑ، یہ انبوہ، یہ ہجوم
ہم تو نکل کے کھوئے گئے خانقاہ سے

تو وہ دفعتہً کھڑے ہوگئے اور دونوں ہاتھ پھیلا کر رقص کرنے لگے

افسوس ہے کہ نقاد کے بند ہونے کے بعد اُن کی زندگی بالکل دوسری ہوگئی اور شعر و سخن یا ادب و انشاء سے انھیں کوئی لگاؤ باقی نہ رہا تھا - اُن کی علالت کا حال بھی مجھے ان کی زندگی میں نہ معلوم ہوا اور موت کی خبر تو خیر مرنے سے پہلے معلوم ہی نہیں ہو سکتی - ان کے بڑے بیٹے سید شاہ انتظام الدین جمالی ام - اس - سی، اُن کے جانشین ہیں، خدا کرے یہ اپنے باپ کے فرزند معنوی بھی ثابت ہوں اور اُن کی یادگار میں کم از کم ان کا دیوان ہی مرتب کرکے شایع کرا سکیں (اگر واقعی کوئی دیوان موجود ہے)

منظم سینی کارخانہ برائے اسٹیل سینی
سلطان بازار حیدرآباد دکن

رسالۂ سخنور
جو جناب آسی کی ادارت میں لکھنؤ سے جاری ہوا
ہے اور جس کا مقصد صرف شعر و سخن اور ادب کی خدمت
انجام دینا ہے - چندہ سالانہ ۲؍ نمونہ مفت
منیجر رسالۂ سخنور احاطۂ فقیر محمد خاں لکھنؤ

باب الانتقاد

مخزن المفردات ہومیوپیتھی

ہومیوپیتھی یعنی علاج بالمثل کا طریقہ اب اسقدر عام، اسدرجہ مقبول اور اتنا مفید ثابت ہوتا جارہا ہے کہ اس کی اہمیت پر گفتگو کرنا لایعنی سی بات ہے۔ ہندوستان میں اول اول اس طریق علاج کو بنگال نے قبول کیا اور اسکے بعد رفتہ رفتہ تمام ملک میں اسکی اشاعت ہونے لگی، حتےٰ کہ ہندوستان میں اب شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جس کے کانوں تک یہ آوازہ نہ پہونچی ہو اور شاید ہی کوئی مگر ایسا ہو جس کو ایک آدھ بار اس سے واسطہ نہ پڑا ہو —— یہ طریق علاج اپنی ارزانی کے لحاظ سے خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کے لئے اتنا موزوں و مناسب ہے کہ شاید ہی کوئی دوسرا اس کے مقابل آسکے، پھر فائدہ کا یہ عالم ہے کہ اگر دوا ٹھیک تجویز ہو جائے تو تیر کی طرح کام کرتی ہے

انگریزی میں تو خیر کثرت سے اور بڑی بڑی تصانیف اس موضوع پر پائی جاتی ہیں، لیکن اردو میں بہت کم ہیں، اور جو ہیں بھی وہ نہ ہونے کے برابر ہیں - دو چار کتابیں لاہور سے اور اتنی ہی لکھنؤ سے شایع ہو چکی ہیں، لیکن کوئی ایسی تصنیف جو پورے طور پر خواص الادویہ کو حاوی ہو کوئی نہ تھی —— اب ڈاکٹر کانشی رام صاحب ہومیوپیتھ نے جو عرصہ سے یہیں لکھنؤ میں اپنا کامیاب مطب چلا رہے ہیں اس کمی کو پورا کیا اور تین ضخیم جلدوں میں مخزن المفردات ہومیوپیتھی شایع کرکے ایسی بیش بہا خدمت ملک و قوم کی انجام دی ہے کہ اسکی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے —— ہومیوپیتھی میں اصل چیز یہ معلوم کرنا ہے کہ کسی دوا کی کیا خصوصیات ہیں، یعنی ایک مریض کے حالات کس دوا کے علامات سے زیادہ ملتے جلتے ہیں اور اصل ڈاکٹر وہی ہے جو ایسی دوا کو ڈھونڈھ نکالے - پھر جو لوگ عرصہ سے اس کام کو کر رہے ہیں اور روز کے تجربہ سے انھیں معلوم ہو چکا ہے کہ فلاں فلاں امراض میں زیادہ تر فلاں فلاں ادویہ کے علامات نمودار ہوتی ہیں، ان کے لئے تو نسخہ تجویز کرنا چنداں دشوار نہیں، لیکن عام لوگوں کے لئے یہ بہت دشوار ہے اور اسی دشواری کی دور کرنے کے لئے ڈاکٹر صاحب موصوف نے یہ کتاب شایع کی ہے۔

تینوں جلدیں تقریباً ۳۰۰۰ صفحات محیط ہیں اور تمام اُن دواؤں کے خواص سے بحث کرتی ہیں جن کے متعلق ہومیوپیتھی میں اس وقت تک تحقیق مکمل ہو چکی ہے —— ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کتاب کی طیاری میں نہ صرف انگریزی کی متعدد کتابوں سے مدد لی ہے بلکہ خود اپنے تجربات بھی پیش کئے ہیں جو از بس مفید و کارآمد ہیں اسی کے ساتھ ہر دوا کے علامات اسقدر شرح و بسط کے ساتھ بتائے ہیں کہ اگر بغور ان کا مطالعہ کیا جائے تو دوا کی تجویز میں غلطی کا بہت امکان بڑھ جاتا ہے —— پھر زبان بھی بہت صاف اور طرز بیان بھی سُلجھا ہوا ہے —— وہ حضرات جو اس فن سے کسی قسم کی دلچسپی رکھتے ہیں، ان کے لئے اس کتاب کا اپنے پاس رکھنا لازم ہے —— تینوں جلدوں کی یکجائی قیمت ۱۶ عـہ کسی طرح زاید نہیں —— بھارت ہومیو فارمیسی، چوراہا قیصر باغ لکھنؤ، اس کے ملنے کا پتہ ہے

نسخہ جات ہومیوپیتھی

یہ کتاب بھی ڈاکٹر کانشی رام صاحب کی تالیف ہے اور ان لوگوں کے لئے جو

معمولی امراض میں بغیر زیادہ کاوشش کے دوا تجویز کرنا چاہتے ہیں، بہت کارآمد ہے - اس میں ردیف وار تمام امراض کا ذکر کرکے اس کی دوائیں درج کردی ہیں - اور اسی کے ساتھ مختصراً یہ بھی بتا دیا ہے کہ کن کن حالات میں کونسی دوا دینا مناسب ہے - خوراک کا دقفہ اور دوا کی طاقت بھی ساتھ ساتھ ہی دے دی گئی ہے - یہ کتاب اس قابل ہے کہ سفر و حضر میں ہر وقت انسان کے پاس رہے - قیمت عہ ہے اور بھارت فارمیسی سے یہ بھی مل سکتی ہے

جرمنی کی قومی بیداری اسوقت سیاسیاتِ عالم میں جرمنی کا مسئلہ نہایت اہم مسئلہ سمجھا جاتا ہے اور بین الاقوامی سیاست کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کے سمجھنے کے لئے اس مسئلہ پر غور کرنا ضروری نہ ہو - یہ کتاب فی الاصل فرانسیسی زبان میں لکھی گئی تھی، جس کا ترجمہ انگریزی میں ہوا اور اب انگریزی سے اردو میں ہوا ہے - اس کے مترجم محمد امیر الحسن صاحب ہیں جو ٹائمس آف انڈیا کے رپورٹر ہیں

اس کتاب میں موجودہ نازی تحریک کے آغاز و نشو و نما، اس کے داخلی و خارجی اسباب، ہٹلر کے حالاتِ زندگی، اور اس کے پروگرام سے بحث کرتے ہوئے جرمنی کی جدید خارجہ پالیسی اور یہودیوں کے خلاف جرمنی تحریک سے مفصل بحث کی گئی ہے -- ترجمہ صاف و سادہ ہے - گو کہیں کہیں الجھا ہوا ہے ----- اس کی قیمت ۱۲؍ ہے اور ذیل کے پتہ سے مل سکتی ہے

محمد امیر الحسن صاحب ---- عدن والا بلڈنگ - دوسرا الہ - روم نمبر ۴۸ بریل روڈ - بمبئی

سمندر کا عجائب خانہ سلسلۂ عجائباتِ قدرت کی یہ پہلی کتاب ہے جسے سید محمد عسکری جعفری نے تالیف کیا ہے - اس میں آبی جانوروں کے دلچسپ حالات نہایت صاف و شگفتہ زبان میں بیان کئے ہیں اور جا بجا نقوش و تصویریں بھی دیدیے ہیں ---- نیچرل ہسٹری کے متعلق ایسی کتابوں کی سخت ضرورت ہے اور اگر مؤلف نے اسی طرح اس سلسلہ کو رفتہ رفتہ مکمل کردیا تو بڑی خدمتِ ملک و زبان کی ہوگی - یہ کتاب ۱۲؍ میں مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی سے مل سکتی ہے

معیارِ ادب انڈین پریس الہ آباد نے اس نام سے چار ریڈریں، پانچویں، چھٹی، ساتویں، اور آٹھویں جماعت کے لئے شایع کی ہیں - ان کو سید حامد علی صاحب اور قاضی خورشید احمد صاحب نے متفقہ کوشش سے مرتب کیا ہے ---- ان ریڈروں کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تمام مضامین خواہ وہ نظم کے ہوں یا نثر کے انتخاب نہیں کئے گئے ہیں - بلکہ اوریجنل ہیں - اور اس بات کو پیش نظر رکھ کر لکھے گئے ہیں کہ کس جماعت میں کس قسم کے اسباق ہونے چاہئیں

گو زبان و محاورہ کی غلطیاں ان میں بھی پائی جاتی ہیں ---- تاہم دوسری ریڈروں کو دیکھتے ہوئے بہت غنیمت ہیں

صنم خانۂ خیال

شیریں لبوں میں خلد کا مفہوم بے نقاب
زلفوں میں جھومتی ہوئی موجِ جنوں نواز
موجِ جنوں نواز میں طوفانِ بیخودی
طوفانِ بیخودی میں تمناؤں کا گداز
باتوں میں لہلہاتی ہوئی جام کی کھنک
اور جام کی کھنک میں بہاروں کے برگ و ساز
اعضا میں لوچ، باتوں میں رس، دل میں سیتیاں
آنکھوں میں نور، نور میں رنگینیٔ مجاز!
رنگینیٔ مجاز میں گہری حقیقتیں
گہری حقیقتوں میں بہت ہی عمیق راز
رازوں میں میرے شعر کا سرچشمۂ جمال
وہ ہیں عدم کہ ایک صنم خانۂ خیال

عدم

التفات اوّلیں

ہوا خواب تمنا صرفِ تعبیرِ فراموشی
اب احساسِ کشش ہے — اور نہ زنجیرِ فراموشی
تغافل ہی تغافل رہ گیا بزمِ محبت میں
جھلکتی ہے ہر آئینے میں تصویرِ فراموشی
بسایا تھا کبھی قصرِ محبت جن نگاہوں نے
نظر آتی ہیں اب مصروفِ تعمیرِ فراموشی
جسے تم خود کبھی اپنا شہیدِ ناز کہتے تھے
وہی محروم ہے اب زخمیٔ تیرِ فراموشی
بجھانا تھا تمھیں شمعِ محبت کو بجھا بیٹھے
بھلانا تھا تمھیں ناشادِ الفت کو ـ بھلا بیٹھے

مگر شاداب ہے میری وفا کا گلستاں اب بھی
یہ دنیا ہے ہم آغوشِ بہارِ بے خزاں اب بھی
جو اک میکش کو بابِ میکدہ تک کھینچ لائی تھیں
وہی مدہوشیاں ہیں کارواں در کارواں اب بھی
بہت سی داستانیں صبح تک ـ دہرائی جاتی ہیں
بتاتے ہیں مری خاموشیوں کے رازداں اب بھی
وہی رنگینیاں اب تک گذرگاہِ تخیل میں
بہشت آباد ہوتی ہیں مری تنہائیاں اب بھی
غرض — اب بھی وہی دورِ وفا بنیاد باقی ہے
تمھارے التفاتِ اوّلیں کی یاد باقی ہے

روشؔ صدیقی

خوابِ بیداری

نصف شب کی خنک فضاؤں میں کہکشاں کی لطیف چھاؤں میں
چُپ سے ہوتے ہیں جب در و دیوار سرد ہوتا ہے جب ہر اک بازار
چھائی ہوتی ہے جب مناظر پر ایک کیفیتِ سکوں پرور
آسمانوں پہ ماہ و انجم سے جب اُبلتے ہیں نور کے چشمے
سبزۂ محوِ خواب پر پیہم جب فضا سے ٹپکتی ہے شبنم
جب سُناتی ہے شب کی خاموشی ہلکی ہلکی لطیف موسیقی
قدسیوں کے گروہ پر کھولے جب اُترتے ہیں آسمانوں سے
زہرۂ عرش کے ترنم پر رقص کرتے ہیں جب مہ و اختر
محوِ گلگشت ہوتی ہیں روحیں خواب کے جب بہشت زاروں میں
جبکہ ہوتا ہے نیند میں مخمور سارے دن کا تھکا ہوا مزدور
جب شجر محوِ خواب ہوتے ہیں بام و در محوِ خواب ہوتے ہیں
ایسا محسوس ہوتا ہے مجھکو جیسے میں نے شراب پی لی ہو
روح ہوتی ہے غرقِ کیفیت تیز ہوتی ہے قلب کی حرکت
دوڑتی ہیں سرور کی لہریں میری رگ رگ میں ریشے ریشے میں
پھر اسی سرخوشی کے عالم میں ہاں اسی بے خودی کے عالم میں
دفعتاً کوئی سامنے آکر مجھکو بے ہوش و بے خبر پاکر
اپنے رُخ سے نقاب اٹھاتا ہے
میری حالت پہ مُسکراتا ہے

اسرارالحق مجاز (علیگ)

کیفِ غم

غم بظاہر اک اثر، اک کیفیت کا نام ہے
فی الحقیقت اک شراب، اک بادۂ بے جام ہے

غم اگر اپنی تجلّی سے نہ ضو تابی کرے
ہو نہ ہرگز اس کا عرفاں، روح جس کا نام ہے

غم نہیں جزوِ مسرّت تو مسرّت کچھ نہیں
وہ حقیقت میں مسرّت ہے جو غم انجام ہے

غم نہ ہو تو آئینۂ ہستی کا دُھندلا ہی ہے
یہ مری تاریک محفل کا چراغِ شام ہے

غم سے تکمیلِ حیاتِ عشق ہے اے بے خبر
زندگی پُر غم نہ ہو تو زندگی خام ہے

کیوں پسند اسکو کروں جو چیز ہے عالم پسند
ہے پسندیدہ جہاں کو عیش، مجکو غم پسند

ساقیٔ فطرت عطا کر خاطرِ برہم مجھے
ہے گراں اوراقِ گل پر قطرۂ شبنم مجھے

عیش و عشرت نے بھری محفل کو غافل کر دیا
بزمِ عالم میں بچھانی ہے صفِ ماتم مجھے

اپنے دل کے خون سے بجھتی ہے میری تشنگی
موجِ بادہ سے نہیں ہے فکرِ کیف و کم مجھے

چاہتا ہوں جرعۂ غم سے نشاطِ بیخودی
ہے ابھی اندیشۂ نیرنگیٔ عالم مجھے

ہر خوشی دنیا کی ہے صرف ایک دھوکا اک فریب
زہر آلودہ نظر آتا ہے جامِ جم مجھے

مست ہوں اپنے خیالاتِ پریشاں میں ہنوز
اک نشاطِ جاوداں ہے کاہشِ پیہم مجھے

کچھ تو ہو دنیا میں اور مجھ میں مذاقِ امتیاز
کیفِ عشرت دے جہاں کو، دو کیفِ غم مجھے

غم سے انساں عالمِ فانی میں سرافراز ہے
غم نہیں، میرے نظامِ زندگی کا راز ہے

فضل الدین آثر (اکبرآبادی)

جوئبار سے خطاب

مست نغموں سے نہ کر دل کو مرے یوں بیقرار
شادمانی سو رہی ہے، اور سونے دے ابھی

میرا دل ہے لذتِ موہوم کا سرمایہ دار
آنسوؤں سے غم کی بارش اور ہونے دے ابھی

دل کا ہر احساس زخمی ہو چکا ہے لاکھ بار
دل کی دنیا کو متاعِ صبر کھونے دے ابھی

فطرت (واسطی)

غزلیات

علی اختر

یہ بھی نظر کا دھوکا ہے یا کارِ نظر ہے کیا معلوم
سطح پہ ذرّے رقصاں ہیں، یا موجِ گہر ہے کیا معلوم

کون نہ جانے محوِ ستم ہے، ناحق شکوہ کیوں کیجئے
چرخ ہے یا اس پردے میں وہ عربدہ گر ہے کیا معلوم

وہ بھی ہیں کچھ کھوئے ہوئے سے جنکو واقف کہتے ہیں
ہستی کے اسرارِ نہاں کی کسکو خبر ہے، کیا معلوم

راتوں کو اٹھ اٹھ کر ہمدم! اک مدت سے روتا ہوں
میری آہِ نیم شبی میں کوئی اثر ہے کیا معلوم

ہستی کا ہنگامہ بپا ہے، سانس کے آنے جانے پر
عالم ضبط و تمکیں ہے یا رقصِ شرر ہے کیا معلوم

دیوانے تو دیوانے ہیں ان کو اپنا ہوش نہیں
عقل پہ جنکو ناز ہے اتنا ان کو مگر ہے کیا معلوم

ہجر کی شب طوفانِ ہجومِ اشک میں اتنا ہوش کہاں
سینے میں ہے قلب کہ صرف دیدۂ تر ہے کیا معلوم

ہنس کے تو رو کر ہی گزاریں گھڑیاں عمرِ فانی کی
ہوگا، پاسِ دردِ محبت ان کو اگر ہے، کیا معلوم

مدت گزری اختر کی بابت نہ کسی سے کوئی خبر
مر گیا وہ ناشاد کہ اب تک خاک بسر ہے کیا معلوم

سید اصغر جعفری ساڈھوروی

رنگت بدل گئی ہے تمھاری شباب میں
ڈوبے ہوئے ہو سر سے قدم تک شراب میں

جو دل ہے محشرِ غم و حسرت ہے ان دنوں
دنیا بدل گئی ترے عہدِ شباب میں

شب کو وہ دلکشی تھی کہ ممکن نہیں بیاں
کل تم چھپے ہوئے تو نہ تھے ماہتاب میں

وہ جانِ نغمہ کون سے پردے میں ہے نہاں
جس کی صدائیں گونج رہی ہیں رباب میں

اصغر وہ حسن و عشق کے افسانے یاد ہیں
عالم ہی اور تھا مرے دورِ شباب میں

عبد اللطیف تپش ایم ۔ اے

انکی ترچھی نظر ہے کیا کہئے
اور پھر کس قدر ہے کیا کہئے

پردہ داری کا کس کی چرچا ہو
کون یہ پردہ در ہے کیا کہئے

قصۂ اشکِ نامرادیِ غیر
منفعل چشمِ تر ہے کیا کہئے

وہ تماشائے خلوت آرائی
اب سرِ رہگذر ہے کیا کہئے

پوچھتے ہیں مآلِ سجدۂ شوق
یہ بھی اک دردِ سر ہے کیا کہئے

شمعِ ہستی کا ابھی افسانہ
کوئی دم میں سحر ہے کیا کہئے

ہونیوالا ہو کیا تپش انجام
ان کو سب کچھ خبر ہے کیا کہئے

راز رامپوری

تری نظر میں ہے سامانِ صد بہار آجا
بہارِ گلشنِ عالم ترے نثار آجا

تجھے ہے رسمِ زمانہ پر اختیار آجا
مٹا کے قیدِ سرِ بام و رہگذار آجا

بہار و کیفِ حیاتِ بہار کی سوگند
خزاں نصیبوں کی جانب بھی ایکبار آجا

ابھی تو راز صدائیں شناخت کرتا ہے
ابھی تو ہے ترے آنیکا انتظار آجا

جنوری سنہ ۳۵ء کے لئے

حسب ذیل عنوانات پر مقالے درکار ہیں

(۱) دہلی اور لکھنؤ اسکول کی شاعری پر مؤرخانہ نظر اور ان کی خصوصیات

(۲) دونوں اسکولوں کے اکابر اور ان کا فرق مدارج

(۳) فن اور زبان کی حیثیت سے دونوں کا مرتبہ

(۴) لکھنؤ اسکول پر دہلی کا اثر

(۵) دہلی اسکول پر لکھنؤ کا اثر

(۶) دونوں اسکولوں کی غزلگوئی پر تفصیلی تبصرہ

(۷) لکھنؤ اسکول کے تین بہترین شاعروں کے ۲۰، ۲۰ شعر

(۸) دہلی اسکول کے تین بہترین شاعروں کے ۲۰، ۲۰ شعر

(۹) منظوم افسانے یا مثنوی لکھنؤ اسکول میں

(۱۰) منظوم افسانے یا مثنوی دہلی اسکول میں

(۱۱) دکن اور اردو شاعری (اسوقت تک تمام ادوار پر تبصرہ)

(۱۲) پنجاب اور اردو شاعری (اسوقت تک تمام ادوار پر تبصرہ)

(۱۳) تذکرہ نگاری کی حیثیت سے لکھنؤ اور دہلی کے خدمات

(۱۴) دونوں اسکولوں کے کارنامے، رباعیات مرثیہ، قصیدہ و نعت میں

(۱۵) دولت مغلیہ کے انحطاط کا اثر دہلی کی شاعری پر

(۱۶) شاہان اودھ اور لکھنوی شاعری

(۱۷) دہلی اور لکھنوی شاعری میں اخلاقی و مذہبی عنصر

(۱۸) شاعری کے لحاظ سے لکھنؤ کا دور زریں

(۱۹) شاعری کے لحاظ سے دہلی کا دور زریں

(۲۰) لکھنؤ اسکول کا سب سے پہلا شاعر جس نے دہلی کا تتبع کیا

(۲۱) دہلی اسکول کا سب سے پہلا شاعر جس نے لکھنؤ کا تتبع کیا

(۲۲) لکھنؤ اور دہلی کے وہ شعرا جنہوں نے ملک و قوم کو کوئی خاص پیغام پہنچایا

(۲۳) کیا دہلی اسکول رو بہ انحطاط ہے اور کیوں

(۲۴) کیا لکھنؤ اسکول رو بہ انحطاط ہے؟ اور کیوں

(۲۵) رامپور کا تعلق دہلی اور لکھنؤ اسکولوں سے

(۲۶) حیدرآباد اور لکھنؤ و دہلی اسکول کا اس سے تعلق

(۲۷) کیا لکھنؤ اسکول نے کلکتہ میں بھی شاعری کو متاثر کیا؟

(۲۸) کیا لکھنؤ اسکول میں اصلاح کی ضرورت ہے؟ اگر ہے تو کیا

(۲۹) کیا دہلی اسکول میں اصلاح کی ضرورت ہے؟ اگر ہے تو کیا

(۳۰) مستقبل میں آپ کو اردو شاعری سے کیا توقعات ہیں؟

(۳۱) دونوں اسکولوں کے وہ شعرا جنہوں نے قدامت کو ترک کر کے کسی ابداع و اختراع سے کام لیا

(۳۲) لکھنؤ اور دہلی کے ریختی اور ہزل گو

(۳۳) لکھنؤ اور دہلی کی خواتین جنہوں نے شاعری میں نمایاں حصہ لیا

(۳۴) لکھنؤ اسکول کے مختلف ادوار اور ہر دور کے بہترین شاعر

(۳۵) دہلی اسکول کے مختلف ادوار اور ہر دور کے بہترین شاعر

(۳۶) آگرہ اور دہلی کا شاعرانہ تعلق

نوٹ:- لکھنؤ اور دہلی کی شاعری سے مراد وہ تمام شعرا ہیں۔ جو یہاں کی شاعری سے متاثر ہو کر اسی رنگ میں شعر کہتے ہیں۔ اس کے لئے کسی خاص جگہ کا باشندہ ہونے کی شرط نہیں ہے

"ہمایوں"

پنجاب کا قدیم ترین ماہوار ادبی رسالہ

اگر آپ اب "ہمایوں" کے ششماہی خریدار بنجائیں تو آپ کو "ہمایوں" کا ایک بہترین اور دلچسپ "افسانہ نمبر" مقررہ ششماہی چندہ میں بلا زائد قیمت کے مل جائیگا۔
اگر آپ سالانہ خریدار بنجائیں تو نہ صرف افسانہ نمبر بلکہ ایک شاندار اور ضخیم سالگرہ نمبر بھی آپ کو مقررہ سالانہ چندہ میں بلا زائد قیمت کے مل جائے گا۔

"ہمایوں" کے مضامین نظم و نثر کے علاوہ اسکی تصاویر اور دیگر ظاہری محاسن کا بلند معیار بھی مسلّم ہے۔ ہمایوں کی چند خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ "ہمایوں" ہر مہینے مختلف قسم کے مذاق کو مدنظر رکھکر مرتب کیا جاتا ہے اسلئے اس میں مضامین اور معلومات کا جتنا تنوع ہے اور کسی رسالہ میں نہیں ہوتا۔ ۲۔ یہ رسالہ چونکہ یادگار کے طور پر نکالا گیا ہے اسلئے اس کی کتابت طباعت کاغذ اور دیگر ظاہری محاسن پر دل کھولکر روپیہ صرف کیا جاتا ہے ایسا رسالہ ایک مستقل طریق سے جاری ہوا ہے۔ ۳۔ بارہ سال میں آج تک کبھی یہ رسالہ ایک دن کی دیر سے بھی شائع نہیں ہوا۔ ہندوستان کا کوئی رسالہ "ہمایوں" کی طرح اس باقاعدگی کا دعوےٰ نہیں کر سکتا۔ ۴۔ ہمایوں کا ساتواں سال بہترین ہے اسلئے اس کا معیار مضامین بلند ہے اور زبان نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان بھر میں مستند ہے اور کوئی رسالہ اتنی توجہ اور محنت سے مرتب نہیں کیا جاتا۔ ۵۔ ہندوستان کے بہترین سحر طراز ادیب، سحر بیان شاعر اور افسانہ نگار صرف ہمایوں ہی میں اپنے بہترین مضامین شائع کراتے ہیں اسلئے اس رسالہ کا ہر عام نمبر بھی عام رسائل کے خاص نمبروں سے بہتر ہوتا ہے۔ ۶۔ "ہمایوں" کے خاص نمبروں کی الگ قیمت نہیں لی جاتی بلکہ سالانہ چندہ ہی میں تمام خاص نمبر مل جاتے ہیں۔ ۷۔ ہمایوں کی نظمیں مضامین، افسانے اور تصاویر پاکیزہ ہوتی ہیں اور اس رسالہ کا معیار اخلاق اتنا بلند ہے کہ اس میں قابل اعتراض اشتہارات بھی درج نہیں کئے جاتے خواہ کتنا ہی مالی نقصان اٹھانا پڑے۔ ۸۔ "جہاں نما" اور "محفل ادب" کے زیر عنوان ہر مہینے اس میں اردو انگریزی رسائل کے بہترین انتخابات درج ہوتے ہیں یہ رسالہ پڑھنے کے بعد کسی دوسرے رسالہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ ۹۔ ہمایوں میں نہ صرف لطیف ادب کے دلچسپ مضامین اور نظمیں ہی شائع ہوتی ہیں بلکہ علمی، تاریخی، تمدنی اور معاشرتی مسائل پر بھی پر از معلومات مضامین شائع ہوتے ہیں۔ یہ رسالہ صرف دلچسپ ہی نہیں بلکہ مفید بھی ہے۔

ہمایوں کی یہ چند خصوصیات بیان کرنے کے بعد میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ کم از کم اس کا مفت نمونہ ضرور منگوا لیجئے اگر آپ کو قدیم نمونہ پسند آیا تو نئے پرچے اور بھی پسند آئیں گے کیونکہ یہ رسالہ روز بروز ترقی کرتا ہوا اب بہت بلند معیار کو پہنچ چکا ہے۔

چندہ سالانہ ۶؎ (مع محصول) — چندہ ششماہی ۳؎ (مع محصول)

منیجر رسالہ ہمایوں ۲۳ لارنس روڈ لاہور